ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

ساغرِ ادب

مظفرپور

پیئر ریویوڈ اردو جرنل

(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء)

مدیر (اعزازی)

پروفیسر سید آلِ ظفر

ساغرِ ادب Vol. : 3, Issue : 11 Oct. to Dec. 2021 مدیر (اعزازی) : پروفیسر (ڈاکٹر) سید آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 03, Issue : 11
October to Dec. 2021

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Prof. (Dr.) Syed Alay Zafar

UNIVERSITY DEPTT. OF URDU
B. R. A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001 (BIHAR)
MOB. +91 94300 84261, +91 90062 53903

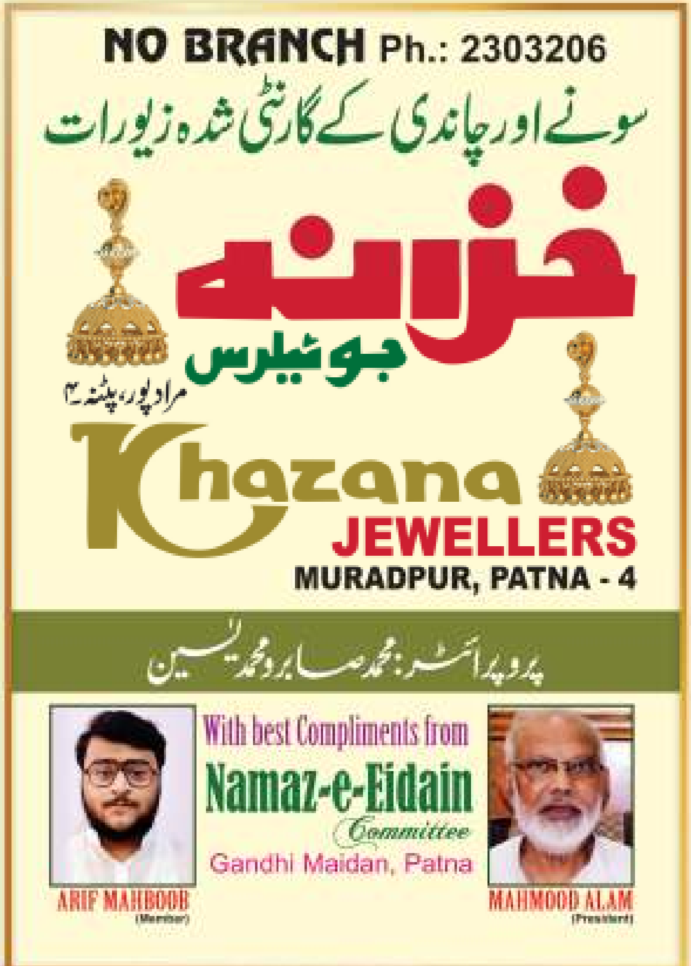

ISSN : 2582 - 3612

سہ ماہی
ساغرِ اَدبؔ
مظفرپور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

پروفیسر

پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اُردو

بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسیٹی، مظفرپور

بہار (انڈیا)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Quarterly
SAGHAR E ADAB Muzaffarpur

(Peer - Reviewed Urdu Journal)

جلد : ۳ شمارہ : ۱۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء

مُدیر (اعزازی) : پروفیسر سیّد آلِ ظفر مُدیرہ : کہکشاں یاسمین

زیرِ تعاون

فی شمارہ : 250 روپے، سالانہ 1,000 روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)، تاحیات 10,000 روپے، دیگر ممالک 60 ڈالر

صفحات : ۲۰۸

تعداد اشاعت : ۵۰۰

سرِورق : سیّد آلِ محتشم، سیّد آلِ حاشر و فائزہ ظفر

کمپوزنگ : امام الدین امام، مظفرپور۔ 62061 43783

Bank Details

SAGHAR E ADAB, Saving A/c No. 3751050251
IFSC : CBIN 0284935
Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar) India

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ''ساغرِ ادبؔ'' کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
کسی بھی قابل اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفرپور عدالت ہی میں ہوگی۔

خط وکتابت و ملنے کا پتہ

The Editor
SAGHAR E ADAB
Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura
P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar) India
Mob. +91 94300 84261, +91 90062 53903

LIST OF EDITORIAL BOARD

1. **Prof. Abuzar Usmani**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Vinoba Bhave University, Hazaribagh

2. **Prof. Najmul Hoda**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur

3. **Prof. Alimullah Hali**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Magadh University, Bodh Gaya

4. **Prof. Farooque Ahmad Siddiqui**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur

5. **Prof. Rais Anwer**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

6. **Prof. Hameed Suharwardy**
Ex. Chairman
Deptt. of Urdu & Persian
Gulbarga University
Gulbarga (Karnataka)

7. **Prof. K. Habeeb Ahmed**
Head
Deptt. of Arabic, Persian & Urdu
University of Madras
Marina Campus, Chennai

8. **Prof. Qamrul Hoda Faridi**
Deptt. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh
(U.P.)

9. **Prof. Manzer Hussain**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Ranchi University, Ranchi

10. **Dr. Amir Mustafa Siddiqui**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Vinoba Bhave University, Hazaribagh

ویب سائٹ

www.saghareadab.in

ای میل

saghareadab@gmail.com

syedalayzafar@gmail.com

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹریس **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ اَدب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور۔ 842 002 (بہار)، انڈیا سے شائع کیا۔

مُدیر (اعزازی) : پروفیسر سیّد آلِ ظفر

ترتیب

نمبر شمار	رشحات قلم	ارباب قلم	صفحہ نمبر
۱	اداریہ	پروفیسر سیّد آلِ ظفر	۶
۲	لا الٰہ الا اللہ	علامہ اقبالؔ	۹
۳	نعت	تنویر پھولؔ	۱۰
۴	شوکت حیات کی ایک کہانی۔ ''مادھو''	پروفیسر محمد محفوظ الحسن	۱۱
۵	نئ ترقی پسندی	پروفیسر قدوس جاوید	۱۹
۶	آتش اور ان کا شاعرانہ مقام	پروفیسر سیّد صابر حسن	۳۸
۷	علی گڑھ فکشن کے پانچ رنگ	غضنفر	۴۳
۸	جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا عصری منظر نامہ	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	۴۸
۹	مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری	ڈاکٹر محمد رئیس	۵۳
۱۰	محمد خالد عابدی: ایک ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	۵۷
۱۱	ترقی پسند اردو ناول	ڈاکٹر محمد صادق حسین	۶۲
۱۲	اردو زبان و ادب پر دوسری زبانوں کے اثرات	ڈاکٹر ارشد اقبال	۶۷
۱۳	حالیؔ کی رباعیوں میں اخلاقیات ونفسیات	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ضیاء	۷۱
۱۴	ناول ''مٹی کے حرم'': ایک جائزہ	ڈاکٹر گل افشاں شمیم	۷۸
۱۵	سرسیّد احمد خاں اور نظریۂ تعلیم	محمد نصیر احمد	۸۲
۱۶	علی سردار جعفری کی شعری انفرادیت	محمد مرغوب عالم	۸۸
۱۷	اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل پروفیسر نجم الہدیٰ کی نظر میں	بدر محمدی	۹۴
۱۸	گوپی چند نارنگ کا تنقیدی شعور	ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن	۱۰۰
۱۹	اُردو غزل کی منفرد آواز: علیم اللہ حالی	ڈاکٹر شبیر احمد	۱۰۵
۲۰	نور جہاں ثروت: غزل کے رزمیہ اظہار کی شاعرہ	ڈاکٹر شعیب انصاری	۱۰۹
۲۱	جموں و کشمیر کی اردو شاعری میں خواتین کا حصہ	محمد طاہر عزیز خان	۱۱۶
۲۲	ناول ''مکان'' فن کے آئینے میں	ڈاکٹر اعجاز احمد	۱۲۱

۲۳	غالبؔ کے اردو قصائد	محمد طارق	۱۲۷
۲۴	پروفیسر منظر حسین کی آزاد شناسی	ڈاکٹر محمد حذیفہ	۱۳۴
۲۵	غروبِ کرب وطلوع نشاط کا شاعر: افتخار عارف	ڈاکٹر مسرور صغریٰ	۱۴۳
۲۶	شہریار اپنی نظموں کے آئینے میں	ڈاکٹر وکیل احمد	۱۴۹
۲۷	اردو غزل میں خواتین کا حصہ	ڈاکٹر فہیم ربانی	۱۵۵
۲۸	علامہ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری	ڈاکٹر نسرین بانو	۱۵۸
۲۹	اُردو کی اہم خاتون افسانہ نگار: ذکیہ مشہدی	ڈاکٹر جاسمین آرا	۱۶۴
	(گوشہ ریسرچ اسکالرس)		
۳۰	دردؔ دہلوی کی شعری خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ	استخار عالم	۱۶۹
۳۱	پروفیسر محمد حسن کی حیات وخدمات پر اِک نظر	ساجد علی	۱۷۲
۳۲	ترقی پسند اُردو شاعری: ایک جائزہ	محمد وسیم الدین	۱۷۶
۳۳	بہار بہ شمول جھارکھنڈ کے مشہور غیر مسلم شعراء کا اجمالی جائزہ	نزہت پروین	۱۸۱
۳۴	راغب کا غیر منقوط نعتیہ مجموعہ ''مدح رسول'': ایک مطالعہ	محمد عارف حسین	۱۸۷
۳۵	نثر ونظم میں شادؔ عظیم آبادی اسکول کو مسلم عظیم آبادی کی دین	ترنم بانو	۱۹۱
۳۶	ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' کا تجزیاتی مطالعہ	رضیہ عائشہ جوائز	۱۹۶
۳۷	''ساغرِ ادب'' کا دسواں شمارہ (آپ کی نظر میں)	....	۲۰۲

ISSN : 2582 - 3612

اداریہ

آج کا اداریہ اُس عظیم ہستی کی نذر ہے جسے بجا طور پر نابغۂ روزگار کہا جاتا ہے۔۱۱؍نومبر کو ان کی تاریخ پیدائش قومی سطح پر تسلیم کر لی گئی ہے اس لئے اس کی مناسبت سے اس اداریہ کا جواز ہے۔سارے ملک میں خاص طور پر اُردو دنیا میں ان کے نمبر اخبار ورسائل میں نکالے گئے۔ان کی سیاسی اور علمی زندگی کی تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی، ہم بھی اسی کو باور کرتے ہیں۔یہ تو صحیح ہے کہ وہ مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین وہیں مقیم تھے اس لئے ان کے گردو پیش کی زبان عربی تھی اور اتنا ہی نہیں والدہ کی جانب سے بھی عربی زبان ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ان کی پدری زبان اُردو تھی۔والد محترم بھی عربی سے اس قدر مانوس تھے کہ روانی کے ساتھ عربی بولتے تھے پھر کم سنی ہی میں والدین کے ساتھ ہندوستان آئے اور کلکتہ میں ان کے والد محترم نے قیام فرمایا۔وہ بیعت وارادت کے سلسلے سے وابستہ تھے اور ان کے بے شمار مریدین کلکتہ میں تھے اور کچھ ان کے آنے کے بعد آموجود ہوئے۔دست بوسی اور قدم بوسی کا معمول تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کو طبعاً پسند نہیں تھا۔ان کا نظریۂ دین مجتہدانہ تھا لیکن معاملہ والد بزرگوار کا تھا اس لئے کبھی مخالفت میں کوئی بات زبان سے نکالنا سوئے ادب سمجھتے تھے۔

مذہبی معاملات میں ''ترجمان القرآن'' کی ان جلدوں کی روشنی میں جو ان کی حیات میں چھپ چکی تھیں، وہ منفرد نظر آتے ہیں۔اس کے باوجود وہ دین کے معاملے میں کبھی سختی اور برہمی کا شکار نہیں ہوئے۔ان کی کتابِ حیات کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک جگہ یہ واقعہ ملتا ہے کہ ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد کی اشاعت میں فرعون کا ذکر آنے پر مولانا ابوالکلام آزاد نے قیاس کیا کہ یہ جس بادشاہ کا ذکر ہے اس کا مجسمہ قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے اس کی تصویر کا کچھ حصہ جس میں انسانی سَر تھا اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں شائع کر دیا۔اس پر کیا کیا ہنگامے ہوئے ہوں گے۔کسی نے مولانا اشرف علی تھانوی کو لکھ بھیجا اور ان سے فتویٰ مانگا۔اشرف علی تھانوی نے بھی کئی اور علما سے رجوع کیا اور متفقہ طور پر قرآن کے سلسلے میں انسانی سَر کی تصویر کی اشاعت کو نہ صرف ناجائز ٹھہرایا بلکہ قرآن پاک کی بے حرمتی سے تعبیر کیا۔کہتے ہیں کہ اہلِ علم اور اہلِ قلم اگر کسی علمی جھگڑے میں پڑیں تو کوئی اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور جب مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیت نشانے پر ہو۔وہ کیا کچھ نہیں لکھ سکتے تھے اور ان کی تائید کرنے والے بھی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

دس بیس آدمی منظرِ عام پر آجاتے لیکن جاننے والوں کو حیرت ہوگی کہ مولانا آزاد نے اپنی طبیعت کی سادگی کی وجہ سے ناشر کو یہ حکم بھیجا کہ آئندہ کی اشاعت سے اس تصویر کو نکال دیا جائے اور اتنا ہی نہیں پہلی اشاعت میں جو کاپیاں بچ گئی ہیں، ان سے وہ تصویر خارج کر کے طلب گاروں کو یا بازار میں بھیجیں۔ایسی عدیم المثال ہستی ڈھونڈے نہیں ملے گی۔خود مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کے اس ردِ عمل کو بہ نظر استحسان دیکھا اور رسائل میں شائع کرایا۔دوسرے لوگوں نے بھی تحسین وخراجِ عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ابتداء ہی سے ہندوستانی قوم پرستی کو صحیح سمجھا اور اسے اپنایا۔ہمارا ملک تاج برطانیہ کے زیرِ نگیں تھا۔یہ بات جن لوگوں کو پسند نہ تھی انہیں میں مولانا آزاد بھی تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کی لڑائی لڑنے والوں میں شامل ہوگئے۔پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کا ساتھ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے علاوہ زندان وسَلاسل میں بھی رہا۔مولانا آزاد کئی جیلوں میں رہے کبھی ان کو قید سادہ کی سزا دی گئی اور کبھی قید سخت کی۔قید سخت کی سزا بھی ایک سال کی تھی جس پر ان کی وفادار اہلیہ زلیخا بیگم نے کہا تھا کہ ملک وقوم پر فدا ہونے والے کے لئے یہ سزا بہت کم ہے۔ہم تو ظلم کرنے والوں سے اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے بارے میں قیاس کرسکتے ہیں لیکن سال پورا ہونے سے پہلے غالباً گیارہ مہینوں میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو کا ساتھ احمد نگر جیل میں بھی ہوا۔ایک بار رانچی کے قید خانے میں وہ اکیلے بند رہے اور ''ترجمان القرآن'' کی جلدیں وہیں لکھی گئیں۔''غبار خاطر'' کی تصنیف احمد نگر جیل میں عمل میں آئی۔''غبار خاطر''اور Nehru's letters to his daughter دونوں کی نوعیت بہت حد تک ایک جیسی ہے۔دونوں ایسے خطوط کے مجموعے کی حیثیت رکھتے ہیں جو بھیجنے کے لئے نہیں لکھے گئے بلکہ ان کی حیثیت تصنیف کی تھی۔''غبار خاطر''میں مولانا آزاد کے جو مکاتیب شامل ہیں، ان میں اسلوب کی جادو بیانی کے علاوہ متعدد علمی وثقافتی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ مکتوبات متصل اور مربوط نہیں ہیں۔اسی طرح پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی تصنیف Nehru's letters to his daughter احمد نگر کے قید خانے میں درختوں ،گلہریوں اور پرندوں کو دیکھ دیکھ کر مضمون آرائی کی اور ان سے تاریخ ہندوستان کی ہزار سالہ ثقافتی زندگی پر اظہار خیال کیا اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک ایسی دستاویز مرتب کی ہے جس کی روشنی میں تہذیب وثقافت کی عالمی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔

بات مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف وتالیف کی ہے۔دوسرے اذکار ضمنی اور تقابل کے لئے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے لکھنا پڑھنا اور زبانوں میں لیاقت پیدا کرنا ان کی طباعی کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔عربی، فارسی، اردو اور انگریزی سیکھ کر تمام زبانوں میں نوشت وخواند کے شواہد چھوڑ جانا ان ہی کے لئے ممکن تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد محترم کے رکھے ہوئے کئی ناموں میں ایک تاریخی نام فیروز بخت بھی تھا، وہ جس ذہانت وہ فطانت کے مالک تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ مادری زبان عربی، گردوپیش اور ماحول (مکہ معظّمہ) کی زبان عربی اور نو دس سال کی عمر تک عربی بولتے رہنے کے باوجود اردو سے صرف اتنی واقفیت تھی کہ والد محترم کی زبان اردو تھی ،لیکن وہ بھی عرب خاتون سے شادی کرنے کے بعد اور مکہ معظّمہ میں ایک عرصے تک قیام کرنے کے بعد روانی کے ساتھ عربی بولتے تھے، جب ہندوستان منتقل ہوئے اور کلکتہ میں قیام فرمایا جہاں اردو بولنے والوں کے درمیان رہے، لیکن وہاں بنگالی مسلمانوں کی آبادی کے سبب بنگلہ زبان کا ماحول بھی ملا اور ہمارے مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت نے اس قدر جلد اردو زبان میں ایسی دستگاہ پیدا کرلی کہ چند برسوں میں جیّد اور معتبر اہل قلم میں شمار ہونے لگے اور اردو زبان کے وسیع تر دائرے میں بمبئی اور لاہور کے اردو دانوں نے انہیں اس وقت معمّر ادیب سمجھا۔جب ان کی عمر مشکل سے سترہ اٹھارہ سال تھی۔مولانا شبلی نعمانی سے ان کی بمبئی میں ملاقات کا واقعہ بھی لوگوں کو یاد ہے اور وہ اب ادبی لطیفہ سا لگتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے باری باری دو رسائل ''الہلال''اور پھر ''البلاغ'' جاری کر کے اپنی اردو لیاقت کی مُہر ثبت کی اور ان رسائل میں صرف اردو زبان وادب کا جلوہ نظر نہیں آتا بلکہ سیاسی بصیرت کی بھی ایسی کارفرمائی ملتی ہے جس نے ایک رسالے کو پہلے بند کرنے اور پھر دوسرے رسالے کی اشاعت کی پاداش میں جیل جانے کا سامان مہیّا کیا۔اپنی ۷۰رسال کی زندگی میں بے شمار کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں لگے رہنا ایسی عبقری شخصیت ہی کا کام تھا۔سیاسی مصروفیات ایسی تھیں کہ ازدواجی مسرتوں سے دور رہے اور وفادار شریک حیات زلیخا بیگم کی وفا شعاریوں کا ایسا امتحان لیتے رہے کہ اپنی جہد آزادی کے دوران ان کے آخری دیدار سے محروم رہنا بھی گوارا کرلیا، مگر انگریزوں کا احسان نہیں لیا۔آزاد ہندوستان میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے بہت سارے ایسے کام کئے جو انہیں آزاد ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

ابھی ابھی ۲۳ردسمبر ۲۰۲۱ء کی صبح آٹھ بجے یہ جاں کاہ خبر ملی کہ پروفیسر حسین الحق، سابق صدر، شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسیٹی، بودھ گیا (بہار) کا انتقال پُر ملال ہوگیا۔اللہ کریم جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور متعلقین کو، جن کے غم میں ادارہ برابر کا شریک ہے، صبرِ جمیل سے نوازے۔مرحوم بہت سی تصنیفات اور تالیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔فکشن کے بہت بڑے اہل قلم کی حیثیت سے ابھی حال میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا جو بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے۔

۲۳ردسمبر ۲۰۲۱ء

(پروفیسر) سیّد آلِ ظفر

لاالٰہ الااللہ

خودی کا سرِّ نہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا ، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

اگرچہ بت ہے جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

ISSN : 2582 - 3612

تنویر پھولؔ (امریکہ)

نعت

نبی ﷺ کا عشق اس دل میں رہے مولا! بہر صورت
زباں پر ہو نبی ﷺ کی نعت کا نغمہ بہر صورت
نہیں اُن ﷺ سا ملا کوئی ہمیں تاریخ عالم میں
نگاہ دور بیں نے دور تک دیکھا بہر صورت
گواہی غیر مسلم کی ، ذرا دیکھو یہ ''دی ہنڈریڈ'' ۱؎
محمد ﷺ نام اس میں بھی رہا پہلا بہر صورت
''رفعنا'' رب نے فرمایا ، جو دشمن تھا ہوا ابتر ۲؎
نبی ﷺ کا ذکر حق نے کر دیا اونچا بہر صورت
جو مشرک تھے ، بجھانا چاہتے تھے حق کی قندیلیں ۳؎
نبی ﷺ کا دین تیزی سے مگر پھیلا بہر صورت
معافی قاتلِ حمزہؓ کی ، طائف ، فتحِ مکہ ہو
ہے جلوہ رحمت للعالمینی ﷺ کا بہر صورت
ہوا گو فتح مکہ ، لوٹ آئے پھر مدینے میں
مہاجر ہی رہے ہیں والیِ طیبہ ﷺ بہر صورت
نہیں سینے میں دل جن کے ، وہ سوزِ عشق سے عاری
نشانی آپ ﷺ کی ہے گنبدِ خضرا بہر صورت
نبی ﷺ کے ذکر کے انوار سے خائف شیاطیں ہیں
بہا ہے پھولؔ ! اس تنویر کا دریا بہر صورت

۱؎ مائیکل ہارٹ کی کتاب ''دی ہنڈریڈ''
۲؎ سورۃ الم نشرح اور سورۃ الکوثر
۳؎ سورۂ توبہ، آیت ۳۲ اور ۳۳

☆☆☆

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر محمد محفوظ الحسن

شوکت حیات کی ایک کہانی۔''مادھو''

قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں کچھ لوگ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ تمام عمر ایڑیاں رگڑ کر گذار دیتے ہیں۔ یہی حال تخلیقی ادب کی دنیا کا بھی ہے۔ کچھ تخلیقی فنکار ایک دو تخلیقات کے سہارے ہی اپنی منفرد پہچان بنا لیتے ہیں اور بہت سے ایسے تخلیقی فنکار ہوتے ہیں جو ورق کے ورق سیاہ کر دیتے ہیں مگر ان کی کوئی انفرادی پہچان نہیں ہوتی۔

دوسری زبانوں کی بات میں نہیں کرسکتا۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بہار نے چند ایسے فنکار دیئے ہیں جو اپنی ایک تخلیق کے سہارے آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ ایک انجم مانپوری ہیں۔ جن کی تخلیق ''میر کلو کی گواہی'' ان کی پہچان بن گئی۔ دوسرے پروفیسر محمد محسن عظیم آبادی جن کا نام سنتے ہی ''انوکھی مسکراہٹ'' لبوں پر کھیلنے لگتی ہے اور تیسرے شوکت حیات جن کا نام سنتے ہی ''گنبد کے کبوتر'' بے پناہی کے آسمان میں منڈلاتے نظر آنے لگتے ہیں۔ ''سنگھاردان'' کے خالق شموئل احمد بھی ان ہی خوش نصیبوں میں ایک ہیں۔

شوکت حیات اردو افسانہ نگاروں میں وہ نام ہے جس نے اپنی ڈگر خود بنائی ہے۔ وہ نہ صرف افسانہ نگار ہے بلکہ خود اپنے افسانوں کا پارکھ بھی ہے اور شارح بھی۔ اس نے خود اپنی تھیوری دی ہے اور اسی تھیوری کی بنیاد پر اس نے اپنی کہانیوں کو سنوارا اور سجایا ہے۔ شوکت حیات نے معاصرین کے مقابلے میں افسانے کم لکھے ہیں۔ آپ تصور کیجئے کہ جب اس کے معاصرین کے کئی کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں شوکت حیات کا صرف ایک مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یوں تو اس میں اور کئی افسانوی مجموعوں کے شائع کئے جانے کی اطلاع دی گئی ہے مگر میرے علم کے مطابق ابھی تک ان کا اور کوئی دوسرا افسانوی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔

''گنبد کے کبوتر'' میں ۲۵/ افسانے ہیں جن میں آج کی زمینی حقیقت، معاشرتی، سچائی، رشتوں کی ناقدری، پامالی، فرقہ وارانہ فسادات، دہشت گردی کا خوف، مٹی کی سوندھی مہک کی کشش، توہم پرستی، سبکدوشی اور ضعیف العمری کا دکھ درد کے موضوع پر افسانے شامل ہیں۔

ISSN : 2582 - 3612

شوکت حیات کا افسانوی سفر ترقی پسندی کے جمود اور جدیدیت کے ابھار کے دور میں ہوا مگر شوکت حیات کا کمال فن یہ ہے کہ اس نے نہ تو ترقی پسند نظریات کی تبلیغ کی اور نہ ہی جدیدیت کے مہمل اور لایعنی سیلاب میں بہے۔ جب کہانیاں سمجھنے اور افسانے انگیز کرنے کے لئے ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی تھی، تب شوکت حیات زندگی سے جڑے ہوئے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

شوکت بے باک افسانہ نگار ہے۔ وہ بڑے بڑوں کا احترام تو کرتا ہے مگر ان سے مرعوب نہیں ہوتا۔ وہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے میں ہچکچاتا نہیں ہے۔ غالباً ان ہی خصوصیات کی بنا پر شوکت کو اکھڑ افسانہ نگار کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔

شوکت حیات خود تنقیدی اور خود احتسابی کے عمل سے گذرنے والا فنکار ہے۔ وہ اپنے فن کے ساتھ مخلص بھی ہے اور اسے اپنے فن پر اعتماد بھی ہے۔ حد سے بڑھا ہوا اعتماد کبھی کبھی فنکار کو ورغلا بھی دیتا ہے مگر شکر ہے کہ شوکت نے خود کو ابھی تک بچائے رکھا ہے۔

شوکت حیات نے اپنے افسانوی نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''غیر روایتی، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید، افسانے جنھوں نے افادیت، نامیاتیت، اور سارک رائٹرس کانفرنس 2005 علی گڈھ کے موقع پر امکانیت پسندی کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے، نامیاتی افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گذاری کی ہے۔ ان کے خدوخال کو متشکل کرتے ہوئے، عصری، آفاقی، افسانوں کی تخلیق کی ہے''

شوکت کے مذکورہ تحریری بیان سے آپ کو مکمل اتفاق ہو یا نہ ہو، اتنا تو طے ہے کہ شوکت نے کسی ازم کے بینر تلے اپنے فنی قد کو بڑھانے کے بجائے زندگی سے رشتہ استوار کرتے ہوئے عصری تناظر کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ انسان اور انسانیت کی ان بنیادی قدروں پر اپنے فن کی بنیاد رکھی ہے جس سے زندگی کو آج کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ''گنبد کے کبوتر'' کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔

''کوبڑ'' کا موضوع اپنوں کا دیا ہوا دکھ ہے۔ ''گھونسلا'' جنگل کی طرح اگتے شہر اور بے گھری کے منظر نامے کو درشاتا ہے۔ ''میت'' میں سوشل اسٹیٹس بنائے رکھنے کے لئے رشتوں کی ناقدری کی تصویر اتاری گئی ہے۔ ''گنبد کے کبوتر''، بابری مسجد کے سانحہ انہدام سے پیدا شدہ صورت حال اور بے پناہی کے احساس کو چترت کرتا ہے۔ ''اپنا گوشت'' میں خون کے رشتوں کی سفیدی کو منعکس کیا گیا ہے۔ ''رانی باغ'' مٹی کی مہک، للک کشش اور گھر واپسی اور محبت کی بازیافت کی کہانی ہے۔ ''مادھو'' پریم چند کے کفن کے آگے کی کہانی کہتا ہے، دلتوں کے ازلی استحصالی رویہ کے خلاف چٹانی ٹکراؤ اور مقابلہ آرائی کی کہانی ہے۔ ''بھائی'' میں فرقہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

وارانہ فسادات دہشت انگیزی کے خوف کے سائے میں انسانی قدروں کے تحفظ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جبکہ ''مسٹر گلڈر'' میں نیم سرکاری کمپنی یا NGO کی دھوکا دھڑی۔ فریب کاری کا شکار ایک مظلوم کی داستان سناتا ہے۔ فسادات کے اثرات اور سماجی کارکن ''تفتیش'' کا موضوع ہے۔ ''سرخ اپارٹمنٹ'' میں مزدوروں کی زندگی کو مصور کیا گیا ہے۔ استحصال کے خلاف براہ راست احتجاج نہ کر کے گوریلا جنگ جیسی حکمت عملی اپنانے یا پھر یوں کہیں کہ راہ بدل کر استحصال کے خلاف احتجاج ''بانگ'' کا موضوع ہے۔ ''شکنجہ'' میں غریبی کے دکھ کو کہانی بنایا گیا ہے۔ رحمت صاحب آج کے صارفی سماج میں بدلتی قدروں کا نوحہ ہے۔

میرا مقصد بحیثیت افسانہ نگار شوکت حیات کے مقام کا تعین ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ اس کا مقام متعین ہو چکا ہے۔ ''گنبد کے کبوتر'' کے آخری صفحات اس کے گواہ ہیں کہ تمام بڑے پارکھین و ناقدین افسانہ نے شوکت کی افسانہ نگاری کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس کی انفرادی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ میں آئندہ سطور میں شوکت کے صرف ایک افسانہ ''مادھو'' پر گفتگو کروں گا۔

میری شوکت حیات سے کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہے۔ سنتے ہیں کہ وہ نظریاتی طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شوکت کے افسانوں میں بائیں بازو کی نظریاتی تبلیغ نہیں ملتی۔ اکا دکا افسانہ مزدوروں کے دکھ درد کو بیان ضرور کرتا ہے مگر اس کی بنیاد پر اسے بائیں بازو نظریات کا حامل قرار دینا مناسب نہیں۔ وہ فنکاروں کے Stablishment کے خلاف آواز اٹھانے کو کہتا ضرور ہے مگر اس کا انداز وہ نہیں ہوتا جو بائیں بازو کی جماعتوں کا ہوتا ہے۔

''مادھو'' شوکت حیات کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں استحصال اور استحصالی رویہ کے خلاف زبردست احتجاج نظر آتا ہے۔ ''مادھو'' کہانی کا عنوان ہے ''مادھو'' نام سنتے ہی پریم چند کے ''کفن'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور آنکھوں کے سامنے ''مادھو'' اور ''گھیسو'' کی بے حسی رقص کرنے لگتی ہے۔ بدھیا دردزہ سے کراہتی رہتی ہے اور مادھو اور گھیسو الاؤ کے پاس بیٹھے آلو چن چن کر کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی 'بدھیا' کی خبر گیری نہیں کرتا اور ''بدھیا'' یوں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہے۔ بے شرمی، بے حسی اور انسانی اقدار کی ناقدری کا احساس تب اور زیادہ ہونے لگتا ہے جب دونوں باپ بیٹے کفن کے چندے سے شراب پینے لگتے ہیں اور بدھیا کی موت کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اسے دعائیں دینے لگتے ہیں۔

کفن کی کہانی آپ نے پڑھی ضرور ہوگی لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہانی میں آگے کیا ہونے والا ہے اور پلاٹ کس طرح آگے بڑھے گا یہ شوکت نے ابتدائی جملے میں ہی بتا دیا ہے۔ لہٰذا میں، گذری ہوئی کہانی یا آنے والے واقعات کی طرف کوئی نشاندہی کئے بغیر کہانی پر گفتگو مزید کرنا چاہتا ہوں اور

آخر سے پہلے ایک طویل اقتباس کہانی کا نقل کر کے آپ کو زحمت مطالعہ دوں گا تاکہ آپ اس روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ شوکت کا برتاؤ قصے کے ساتھ اور اس کا پلاٹ کیسا ہے اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے لئے محض تضیع اوقات کا باعث ہے یا میں کچھ آپ کو Communicate بھی کر سکا ہوں۔

کہانی کی ابتدا جیسا کہ گذشتہ اوراق میں عرض کیا گیا مادھو کے خواب سے بیدار ہونے سے ہوتی ہے۔ مادھو کا خواب دراصل خواب نہیں یہ وقت کے گذرنے اور بدلنے کا استعارہ ہے۔ دنیا کے نئی کروٹ لینے اور نچلی ذات کے باشعوری کے احساس کی بیداری کا استعارہ ہے۔ شوکت نے جو ابتدائی جملے اس کے لئے تراشے ہیں وہ بے حد بلیغ اور معنوں کی ایک وسیع دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔

بیدار ہونے اور خواب دیکھنے کے دوران، مادھو کا خود کو لعن طعن کرنا۔ اپنے باپ کو اپنا حریف گردانا، اس امر کا استعارہ ہے کہ نچلی ذات کے لوگ بھی احساس کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ان کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز انہیں بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صدیوں کی غلامانہ ذہنیت اور استحصال کی چکی میں پستے رہنے سے ان کا یہ احساس مردہ ہو گیا تھا۔ مگر وقت آنے پر انہیں بھی کسک ہوتی ہے اور وہ بھی انسانی اقدار کی ناقدری پر شرمسار ہوتے ہیں۔ مادھو کی بیداری اور زمیندار کے کتے کو مارنے کی خواہش دراصل شعور کی بیداری کا احساس کراتی ہے، نیز ظالم کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب بھی، زمیندار دراصل پدرم سلطان بود اور وقت کی نبض کو نہ پہچاننے کا استعارہ ہے۔ مادھو کا کاغذ پڑھ کر دستخط کرنے کا عمل دراصل تعلیم کا فروغ ہے اور گذشتہ ۶۵/ سالہ تاریخ کے بدلتے مزاج کا آئینہ جسے شوکت حیات نے بڑی چابکدستی سے قصہ گوئی کے فن میں ڈھالا ہے۔

پریم چند کا مادھو بے حس اور بے عمل ہے جبکہ شوکت کا مادھو بدلتے وقت کے ساتھ بدلنے کا استعارہ، شوکت حیات نے بڑی ہوشیاری سے تعلیم کی اہمیت واضح کر دی ہے اور یہ بھی بتانے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ قوموں کی ترقی میں وقت کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی اس کے انقلابی کردار میں اہم رول نبھاتی ہے۔ شوکت کا مادھو باعمل ہے، باکردار ہے، وہ شوکت کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتا بلکہ خود اپنی راہ منتخب کرتا ہے اور اس پر چل پڑتا ہے۔

''وہ کتنا بدنصیب ہے اچھی بھلی بیوی کے داہ سنسکار کا پیسہ نہ صرف شراب میں اُڑا گیا بلکہ اس کے آخری سفر میں بھی اس کا ساتھ دینے سے محروم رہا'' ''اسے اپنے آپ پر گھن آتی۔''

''کتنا گرا ہوا تھا وہ۔''

''کمینگی کی انتہا تھی۔''

''ہائے رے نامراد (بدھیا...... میں نے تجھے کھو کر سورگ کی دیوی کھودی...... تیری جیسی عورت اب مجھے اس جنم میں ملنے سے رہی۔''

مندرجہ بالا جملے نچلی ذات کے تقلیب قلب کا اشاریہ ہیں۔

بدھیا جس کی موت پر مادھو افسوس کناں ہے اور اپنے کئے پر شرمندہ ...... بدھیا کیسی ہے یہ شوکت حیات سے سنئے۔

''بدھیا پر جوانی کے گل بوٹوں نے کچھ اس طرح اپنے نقوش ابھارے تھے کہ جب کبھی پانی بھرنے مٹکا لے کر وہ پنگھٹ کی طرف جاتی ہوتی راہ گیر اسے دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے۔''

''روکھی سوکھی کھاتے ہوئے بھی بدھیا کے جسم کے کس بل میں کئی برس تک کوئی کمی نہ ہوئی۔''

''اپنے گداز اور پتھر پتھر سے نرم بدن سے وہ مادھو کو بھرپور لذت بہم پہچانے کی بھرپور کوشش کرتی تھی۔''

بدھیا کی جسمانی کشش اس کی خود سپردگی اور نسوانی حسن کو مزید موثر بنانے کے لئے شوکت حیات نے جو تصویر کشی کی ہے اس نے اثر انگیزی میں اور اضافہ کیا ہے۔

''وہ کمال کی عورت تھی۔ آدھا پیٹ کھا کر بھی اکثر اس طرح کھل کھیلتی جیسے اس کا معدہ مرغ ،ماہی اور شراب سے بھرا ہوا ہو۔''

ایک طرف مادھو کو اپنی کمینگی کا احساس، دوسری طرف اس کی بھرپور جوانی سے لطف اندوز ہونے کا نشہ اور تیسری طرف اس کے باپ کی بدھیا کے گدرائے بدن پر للچائی نظر۔ وغیرہ وغیرہ جزئیات پر شوکت حیات کی نظر کی دراکی شوکت کے فنکارانہ کمال ہنرمندی اور فن پر اس کی دسترس کی عمدہ مثال ہے۔

کہا گیا ہے کہ شوکت داخل وخارج کے امتزاج سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں. اسے شوکت حیات کا امتیاز نہیں کہا جا سکتا۔ کیا کوئی فنکار داخلی وخارجی زندگی کے ذکر کے بغیر کسی کہانی کی تخلیق کر سکتا ہے؟ یہاں فنکار سے میری مراد شوکت حیات جیسے ہی فنکار ہیں جو معتبر اور مستند ہو چکے ہیں۔ جن فنکاروں کے یہاں داخلی وخارجی زندگی کا امتزاج نہیں وہ اچھے فنکار کہے ہی نہیں جا سکتے ہیں۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ بعض کہانی داخلی زندگی کی پیش کش کا تقاضہ کرتی ہے اور بعض محض خارجی زندگی کی پیش کش کا۔ ایسا اگر فنی تقاضے کے تحت ہے تو پھر مراد کیا ہے؟ لیکن فنی ضروریات کے بغیر صرف اندرونی یا صرف بیرونی حالات کی پیش کش محض سے کوئی کہانی واقعی کہانی نہیں بنتی جب تک اس میں سکے کے دونوں رخ کو باہم شیر وشکر نہ کر دیا گیا ہو۔ شوکت کی کہانیاں بھی اس تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ مشاہدات وتجربات اور جذبہ واحساس کی آمیزش اور ہم آہنگی شوکت کے افسانوں کی اہم خوبی ہے اور میرے خیال میں ہر بڑے فنکار کے لئے یہ لازمی ہے اگر

ایسا نہیں ہے تو پھر اسے فنکاری نہیں پیوندکاری کہا جائے گا اور بس، شوکت حیات ایک معتبر اور مستند فنکار ہیں اور ان کے افسانہ مادھو میں ان کا یہی فنکارانہ شعور بیداری کے اعلیٰ منازل پر فائز ہے۔

ایک طرف پلاٹ اگر گٹھا ہوا ہے اور واقعہ متاثر کرتا ہے تو دوسری طرف قصے کی پیش کش میں استعمال کئے گئے حربے، جزئیات نگاری، منظر نگاری، واقعات نگاری، مکالمہ نگاری کا کمال بھی کہانی میں نظر آتا ہے۔

مادھو کے کردار کی تخلیق میں شوکت حیات نے بڑی جابکدستی دکھائی ہے۔ مادھو کا جو کردار پہلے سے تخلیق شدہ ہے۔ یہ اس سے الگ ہے۔ کس طرح الگ ہے اس کا اشارہ شوکت نے پہلے ہی جملے میں کر دیا ہے۔ یعنی اچھے برے خواب دیکھنے کے بعد جب مادھو بیدار ہوتا ہے تو اس کا ارتفاع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب جو مادھو کا کردار ہے وہ اسی ارتفاع کا شناخت نامہ ہے اب وہ بے حس بے شعور، بے عمل، لالچی، پیٹ کا بندہ نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ اب وہ باشعور ہو گیا ہے اس کے احساس کی مردہ رگوں میں بیداری کا خون دوڑنے لگا ہے۔ تعلیم نے اس پر قلعی کی ہے اور اس کے اندر ظلم واستحصال کے خلاف بدلے کی آگ اندر اندر سلگ رہی ہوتی ہے جس کے ظاہر کرنے کا موقع زمیندار کا اعلان فراہم کرتا ہے۔ وہ اپنی پشتینی بے حسی، کس مپرسی، مظلومی، غلامی کی ساری زنجیریں توڑ کر زمیندار کے کتے کی گردن دبوچ کر انتقام کی جوالہ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ بڑی شان بے نیازی سے اپنی سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت زمیندار اور اس کی انانیت کی دیوار کو ڈھا دیتا ہے۔ یہاں میں شوکت حیات کے افسانے سے ایک طویل اقتباس معذرت کے ساتھ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

''ندی کنارے پیپل کے پیڑ کے پاس لوگوں کا مجمع اکٹھا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اس دل چسپ مقابلے کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔'' ''چبوترے کو منچ کی طرح استعمال کیا گیا تھا۔''

متعدد کرسیاں اس پر سجی ہوئی تھیں۔ اس علاقے کے سربرآوردہ لوگ مختلف کرسیوں پر براجمان تھے۔ درمیانی کرسی پر زمین دار صاحب تن کر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی کڑی مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ ان کے رعبیلے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ ان کے بغل میں ان کا السیشین کتا ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اور بڑی بے اعتنائی سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔''

''دربان نے رجسٹر کھولتے ہوئے پاٹ دار آواز میں کہا''

''جو بار بار کے اعلان کے باوجود جو رکے کتے کے مقابلے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا''

''زمیندار صاحب نے بڑی حقارت، شان استغنائی اور زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ مجمع کی

طرف نگاہ دوڑائی اور کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔''

لیکن جُجو را ایک آدمی۔

''دربان کی زبان میں ارتعاش پیدا ہوا۔

زمیندار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''جُجو ر مادھو نام کا ایک آدمی مکابلہ کرنا چاہتا ہے۔''

''مادھوا''

''ہاں جُجو ر''

''کون مادھوا''؟

''گھیسو اچمار کا بیٹا جُجو ر''

''اچھا اچھا......وہی جس نے اپنی پتنی کی ہتیا کر دی تھی؟''

زمیندار نے مزید استفسار کیا

''ہاں جُجو ر وہی مادھوا جس نے اپنی پتنی بدھیا کے کپھن کے لئے چندے کے پیسے سراب اور ٹھرے میں اڑا دیئے اور جس نے......جس نے......''

دربان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

پوری بات کہہ

زمیندار نے حکم دیا

''جس نے کپھن کے بچے ہوئے چندے کے پیسے بھکاریوں کو دان کرتے ہوئے کہا تھا میں بھی جمیندار سے کم ہوں کیا......لے......کھوب کھا اور پی اور اسیر باد دے جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی۔ مگر تیرا اسیر باد ضرور پہنچے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں...... میں بھی جمیندار سے کم ہوں کیا......!'' ''اچھا......ایسا کہا تھا اس حرامزادے نے......؟''

''تجھے انگوٹھا لگانا ہوگا ڈیکلریشن (Declaration) پر''

''میں دستخط کروں گا جناب......لیکن کیا کاغذ ہے پڑھنا چاہوں گا......''

زمیندار صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر کڑکتے ہوئے بولے،

''تمہیں اعلان کرنا ہوگا کہ تم اپنی مرضی سے مقابلے میں شامل ہو رہے ہو اور اپنی موت کے ذمہ

ISSN : 2582 - 3612

دار تم خود ہو گے......'' ''لیکن آپ کو بھی ایک بات لکھنی ہوگی'' زمیندار صاحب چونکے۔

''اگر کتا مرا تو میرا کوئی قصور نہیں ہوگا اور میرا جیتا ہوا دس ہزار روپیہ سوخت نہیں کیا جائے گا۔''

اس کے بعد کیا ہوا اس کو نہ بتانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مزید اقتباس نقل کرنے کی ضرورت۔ اس طویل اقتباس میں، منظر نگاری بھی ہے۔ واقعہ نگاری بھی جزئیات نگاری بھی ہے، مکالمہ نگاری بھی، اور سب کے سب اس طرح شیر و شکر ہو کر قصے کو اختتام تک لے جاتے ہیں کہ اس کا بیان ممکن نہیں (مطالعہ کے بعد ہی اس سے پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے)

زمیندار کا حقارت آمیز لہجہ، دربان کی کپکپاہٹ بھری آواز اور مادھو کا پُر اعتماد اور پُرسکون مگر باوقار انداز، مکالمہ کے فطری پن وغیرہ کے فنکارانہ برتاؤ اور ہنرمندانہ استعمال نے شوکت حیات کی فنی دسترس کی بہترین مثال پیش کر دی ہے۔ نیز بدلتے وقت کی پہچان نے فنکار کے عصری شعور، خارجی دنیا کے مشاہدے اور روزمرہ کے تجربے پر گہری مہر لگا دی ہے۔ زمیندار کی اکڑ وقت کی نبض ناشناسی اور اپنی ضد پر اڑے رہنے اور مادھو کو انگوٹھا کا نشان لگانے کو کہنا بدلتے منظرنامہ کی شناخت کی عدم شعوری نیز پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنے کے خطرے کے احساس سے نابلد ہونے کی علامت کے طور پر ابھارنے میں کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔

کہانی کے آخری حصے میں دور سے نگاڑے کی آواز کا آنا۔ مادھو کا کاندھے سے اچانک کود کر نیچے آ جانا، چہرے پر ناگواری کے اثرات کا ظاہر ہونا اور پھر جنگل کی راہ لینا۔ آنے والے خطرات کو بھانپتے ہوئے ایک محفوظ مقام تک پہنچ جانے کے عمل کا اشاریہ ہے۔

زبان کے تخلیقی استعمال، نثر کی سادگی و شگفتگی اور جا بجا لہجے کے اندرونی تیکھے پن نے شوکت حیات کی کہانی کو نہ صرف موثر بنایا ہے بلکہ ایک خوبصورت انجام تک لے جانے میں بھی بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کہانی دلت ادب یا دلت کہانی کی بہترین نمائندہ ہے

میرے خیال میں شوکت کی اہم اور قابل ذکر کہانیوں میں ایک کہانی ''مادھو'' بھی ہے جس کی طرف عام طور پر ناقدین نے توجہ نہیں دی۔

Prof. Md. Mahfuzul Hasan
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya (Bihar)
Mob. - 94308 40627

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر قدوس جاوید

نئی ترقی پسندی

ترقی پسندی؛ سوچ اور فکر کے اس مخصوص و منفرد زاوئے سے عبارت ہے جس کا مقصد عالم انسانیت کی پس ماندگی اور 'استحصال' کے 'نار' کو 'مساوات' اور 'منصفی' کے 'نور' میں تبدیل کرنا ہے۔ اسی لئے ترقی پسندی کو، صحیح خطوط میں، انسانی سماج کے مقدر کی تعمیر کا فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی زندگی اور زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں کے تجزیاتی اور تعمیری شعور کا دوسرا نام ترقی پسندی ہے۔ لیکن یہ بھی دھیان رہے کہ ماضی کے اکتسابات، حال کی تحلیل اور مستقبل کے امکانات کی آگہی کا حامل زرخیز شعور ہی عصری حقائق اور مسائل کی کے حوالے سے ایسے معیاری، اقداری اور فکری نظام کی تشکیل کرسکتا ہے جو سماج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھالنے کا سبب بن سکے۔ 'ترقی پسند فکر' کا اطلاق صرف شعر و ادب پر ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں پر ہوتا ہے خواہ وہ سیاست ہو یا سماجیات، مصوری ہو یا سنگ تراشی یا دیگر مادی و سائنسی انسانی علوم ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبال کے یہاں ایسے بے شمار اشعار ملتے ہیں جنھیں ترقی پسند اشعار ماننے میں کسی کو تکلف نہیں ہوتا۔ انقلاب روس کے پس منظر میں کہا گیا اقبال کا یہ شعر تو ہر خاص و عام کو یاد ہے کہ ؂

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

لیکن اقبال کے یہ دو شعر بھی دیکھئے ؂

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہان چار سو در رنگ و بو
ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رُو

پاکستان کے مشہور مصور صادقین نے علامہ اقبال کے ان دو شعروں کو تصویر کے پردے پر اتارا تو اقبال کے ترقی پسند خیالات گویا مجسم ہو گئے۔ دوسری جانب ہندوستان کے مشہور مصور ایم ایف حسین نے

ISSN : 2582 - 3612

جب ہندوستانی دیوی دیوتاؤں کی چند تصویریں ترقی پسند نظرئے کے تحت بنائیں تو اس کی پاداش میں انھیں ملک بدر ہونا پڑا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ترقی پسندی اور خاص کر ترقی پسند ادب پر وقت بے وقت طرح طرح کے اعتراضات بھی کئے گئے۔ مثلاً یہ کہ ترقی پسند ادب پہلے سے طئے شدہ یا پھر ہنگامی موضوعات پر لکھا جاتا ہے، یا اس میں نعرہ بازی اور پروپگنڈہ زیادہ ہوتا ہے ادبیت کم ہوتی ہے۔ سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون ''تحریک، جمالیات اور سیاست'' (مشمولہ ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر) میں ایسے تمام اعتراضات کا مدلل جواب دے دیا ہے۔ لیکن ایک اہم اعتراض یا غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ترقی پسندی مذہبیت کے خلاف ہے۔ حالانکہ، مارکس، اینگلس، رالف فاکس، اور جارج لوکاچ کے بعد آج کے نو مارکسی دانشوروں، ٹیری ایگلٹن، میکس ویبر اور لوئی آلتھیو سے وغیرہ کے افکار و خیالات کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی برسوں میں ترقی پسندی میں کسی حد تک ادعائیت Dogmatism) ضرور رہی ہوگی لیکن آزادی کے بعد ہندوستان میں ملک کی تشکیل جدید کے لئے جو پنج سالہ ترقیاتی منصوبے بنائے گئے اور جن کی پیروی پاکستان نے بھی کی، اس کی بدولت برصغیر میں سماجی اقتصادی، تعلیمی اور تہذیبی سطح پر، 'داغ داغ اجالا' اور 'شب گزیدہ سحر' کی طرح ہی سہی، کچھ ایسی خوش آئند تبدیلیاں بہرحال رونما ہوئیں جس کا خواب مجاہدین آزادی اور ترقی پسند دیکھا کرتے تھے، لیکن آزادی کے بعد دیسی حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں کے سبب، قومی منصوبوں کا کھوکھلا پن سامنے آنے لگا۔ اور عام لوگوں میں آزادی کے بے فیض ہونے کا احساس شدت اختیار کرنے لگا۔ آزادی کے بعد ادب اور سیاست میں ترقی پسندی کے، حاشئے پر چلے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ کی ناکامی کے بعد ۶۰، ۱۹۵۵ء کے آس پاس ظہور میں آنے والی نام نہاد جدت پسندی/ جدیدیت کے رجحان نے ادب ہی نہیں سیاست اور سماج میں بھی بے سمتی اور کنفیوژن کو فروغ کا موقع دیا۔ ملک و قوم کی حالت ایک بار پھر کم و بیش ویسی ہی ہوتی چلی گئی جیسی کہ آزادی سے پہلے تھی۔ نویں دہائی تک آتے آتے، ''گلوبلائزیشن''، ''بازاریت'' اور'' صارفیت'' (Consumerism) کے حوالے سے برِصغیر میں آنکھیں بند کر کے جس طرح مغرب کے نِت نئے سماجی، معاشی اور ثقافتی نظریات کو سماجی اور ادبی منطقوں میں اپنانے کی کوششیں کی گئیں اس کے نتائج مثبت سے زیادہ منفی ہی برآمد ہوئے، معاشی بحران، اخلاقی زوال، اور بے روزگاری میں اضافہ، اعلی تعلیمی ڈگریوں کی بے وقعتی، سیاست میں نااہل عناصر کا غلبہ، بدعنوانی اور لاقانونیت کی گرم بازاری وغیرہ کے سبب ایک بار پھر عام انسانوں اور انسانیت کی فلاح اور فروغ کا مسئلہ سنجیدہ عوام اور خواص کی سوچ اور فکر کا غالب حصہ بننے لگا۔ اس کا اندازہ ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۹۰ء کے دوران، رومیلا تھاپر، عرفان حبیب، امرتیہ سین، ڈاکٹر علیم، سبط رضی، راجندر یادو، احتشام حسین، قرۃ العین حید، نامور سنگھ، منجو کپور، شوکت

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

صدیقی، محمد حسن، قمر رئیس، اصغر علی انجینیر، شاہد احمد شعیب اور پروفیسرش اختر وغیرہ کے سماجی، ثقافتی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر لکھی گئی تحریروں سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس دور میں مارکسزم ہی نہیں مذہبی اقدار کے حوالے سے بھی نئی سوچ اور فکر کی لہریں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام نے ''دوقومی نظریہ'' کو زیروزبر کر دیا تھا، ایک پُر امن، خوشحال اور باعزت زندگی برِصغیر ہندوپاک کے ہر انسان کی فکر کا بنیادی وظیفہ بن گئی تھی۔ ترقی پسند (ہندو اور مسلم) دانشوروں نے اصلاحی اور تعمیری نظریات پیش کئے۔ لیکن مفاد پرست برسرِ اقتدار طبقہ نے اس پر توجہ نہیں دی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک آکر جب مابعد جدیدیت کے بال و پر نکلے تو مارکسزم سے نظریاتی ادعائیت (کٹر پن) کے عناصر بھی تحلیل (ڈائیلوٹ) ہونے لگے اور 'نو مارکسیت (NEO MARXISM) کی طرح ''نئی ترقی پسندی'' بھی سامنے آنے لگی تھی۔ بلکہ مابعد جدیدیت سے وابستہ اکثر و بیشتر دانشور سابقہ مارکس وادی ہی تھے۔ دراصل یہ نئی ترقی پسندی، بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے شروعاتی دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات (Conditions) کا تقاضہ تھا۔ ویسے بھی ترقی پسندی کسی ایک مخصوص دور کی علامت نہیں بلکہ ہر دور میں ارتقا کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا ایک متحرک اور تغیر پذیر نظریہ ہے جس میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کیونکہ ہر دور کے اپنے تقاضے توقعات، تعصّبات، ترجیحات، اتفاقات اور اختلافات ہوتے ہیں۔ روائتی ترقی پسندی کے ابتدائی دور، یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی اور نئی ترقی پسندی کے شروعاتی دور، یعنی آٹھویں، نویں دہائی کے عالمی حالات میں بہت فرق پیدا ہو چکا تھا۔ ۳۰،۴۰ء کے دوران تیزی سے بدلتی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی صورت حال تخلیق کاروں سے ''انگارے''، اور 'شعلے'، 'کفن' اور ''گئودان'' جیسی شاہکار تخلیقات لکھوا رہی تھی اور عالم انسانیت کو اقبال کی زبان میں ''ہر نقشِ کُہن مٹانے، اُمرا کے در و دیوار گرانے اور بے فیض کھیتوں کو جلانے کی ترغیب بھی دے رہی تھی۔ لیکن ۸۵، ۱۹۹۰ء کے آس پاس تک آکر سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورت حال بہت بدل چکی تھی۔ ان دونوں زمانوں، یعنی 'تیسری دہائی' اور 'نویں دہائی' میں بعض مماثلتوں کے باوجود فرق ہے۔ اس فرق کو لوئیس ڈوما Louis Dumont نے اپنی کتاب ''فردیت، اجتماعیت اور معاشی ترقی کا نظریہ''

Homoaequalis;genesis and development of economic Idealogy میں سماج کے دو ماڈل کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

Individualistic society-1

Holistic society 2.

۱۔ اجتماعی ترقی پر مبنی سماج

۲۔ فردیاتی ترقی پر مبنی سماج

ہولسٹیک سماج میں 'اجتماعی ترقی پر زور دیا جاتا ہے جبکہ ''فردیاتی سماج'' میں گنے چنے افراد کو ہی ترقی کا موقع ملتا ہے۔ سماجی اور معاشی مسائل پر مبنی لوئی ڈوما کی آئیڈیالوجی کے مطابق مارکسزم سے متاثر ممالک، مثلاً سوویت روس اور 'بلغاریہ وغیرہ 'ہولسٹیک سوسائٹی کے قائل تھے جب کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کا سماجی ڈھانچہ فردیاتی (Individualistic) رہا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں سماج کی ان دونوں قسموں کی ملی جلی شکل کو اپنایا گیا لیکن بدقسمتی سے ان میں توازن نہیں برتا جا سکا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سماج ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' ہو کر رہ گیا۔ ہر معاملے میں 'دورنگی (ڈبل اسٹینڈرڈ) یا منافقت ہندوستانی سماج کا خاصہ بن چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستانی آئین Constitution Of India کے آرٹیکل 39 میں ملک کے تمام مذاہب کے شہریوں کے لئے مساوات برابری کی بات تو کی گئی ہے لیکن عملاً ایسا ہو نہیں سکا یا پھر نئے سرمایہ دار، نو دولتیہ طبقہ (New Rich Class) نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ اور آج بھی 'بعض' کارپوریٹ گھرانے ایسا ہونے نہیں دے رہے ہیں۔ اس طرح دولت مند طبقہ، متوسط طبقہ اور غریب طبقہ کے بیچ کی کھائی دن بہ دن چوڑی ہی ہوتی گئی۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ملک کی کُل آبادی کا پچھتر فی صد حصہ کام کرنے والوں (Working Class) یا کام کرنے کی اہلیت رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ جسے ''یوواشکتی'' کہا جاتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ اول تو اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت نہیں ملتی، اور جنہیں ملازمت مل بھی جاتی ہے، ان میں سے اکثریت کو ان کی اہلیت کے مطابق معاوضہ نہیں ملتا۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں یا 'سرکاری اسکولوں میں 'رہبر تعلیم' سے وابستہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کو اتنا کم معاوضہ ملتا ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے (ایسے مجبور و محکوم رہبر اگر ضروریات زندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہزنی پر آمادہ ہو جائیں تو تعجب نہیں ہونا چاہئے)۔ دراصل یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ اپنے وطن میں آزادی کے بعد، ترقی کے منصوبے تو اچھے بنائے گئے لیکن حکومت اور انتظامیہ کی سُستی اور کچھ ذمہ دار افراد کی بدعنوانی کے سبب سماج کے ہر حلقے تک اس کا فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ اور اب بھی نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پالیسی سازوں کو خود بھی اندازہ نہیں کہ اکیسویں صدی میں بھی، جس سماج میں ''''سداچار'' کے نام پر 'دُراچار'' کرنے والے 'باباؤں' کو بھگوان ماننے کی جہالت نہ صرف سر چڑھ کر بول رہی ہو بلکہ اِس جہالت کی حمایت میں توڑ پھوڑ، عصمت دری اور خون خرابہ کے واقعات بھی ہو رہے ہوں، اور جہاں مٹھی بھر فرقہ پرستوں کی جانب سے 'دلتوں اور اقلیتوں سے، دھرم اور 'آستھا' کے نام پر، اپنی مرضی سے کھانے، پینے، پہننے، عبادت کرنے سے لے کر اپنی مرضی سے اپنا نمائندہ چُننے تک کی آزادی تک چھیننے کی بھی غیر جمہوری کوششیں ہو رہی ہوں، اور جہاں پنچائت سے پارلیامنٹ

تک کے انتخابات عوام کو مذہب کے نام پر بانٹ کر جیتے جاتے ہوں ،اس سماج میں 'سب کا ساتھ اور سب کا وکاس' محض ایک نعرہ ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ ملک اور جمہوریت کے مفاد میں اس صورت حال کو بدلنے کے لئے 'کٹر واد' اور 'فرقہ پرستی' کو ایک طرف سرکا کر، سیکولر اور تعمیری، ترقی پسندی سوچ اور فکر کو فروغ دینے کے لئے کیا کرنا چاہئے ؟ اور کیا نہیں، اس پر غور کرنے کی زحمت گنتی کے لوگ ہی کر رہے ہیں، حکومت اور نظام پر سوال اٹھانے والوں پر ''دیش دروہ'' کے نام پر پابند سلاسل کر دینا ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ اسی لئے جمہوریت اور سیکولرزم پر یقین رکھنے والے لوگ موجودہ منظر نامے میں اپنے آپ کو MISFIT محسوس کرنے لگے ہیں۔ (پروفیسر ش۔ اختر نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسندی'' میں ایسے سارے پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے)۔ اب یہاں دو گھڑی رُک کر ایک بار پھر پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ 'انگارے' اور 'شعلے' کے ترقی پسندوں کا سامنا انگریز حکومت کے علاوہ ،زمین داروں ، جاگیرداروں ، مہاجنوں اور سود خوروں پر مشتمل 'سرمایہ دارانہ ''فردیاتی سماج'' اور ''نو آبادیاتی نظام'' (Colonial System) سے تھا جو بڑی ہوشیاری سے ملک اور عوام (ہندوستان اور ہندوستانیوں) کا استحصال کر رہا تھا۔ لیکن یہ نوجوان ترقی پسند (سجاد ظہیر، ملک راج آنند، احمد علی .....وغیرہ) لندن کی روشن راتوں میں کھُلی آنکھوں سے، غلامی اور پسماندگی کی تاریکیوں میں ڈوبے اپنے ملک میں آزاد اور ''ہولسٹیک'' یعنی اجتماعیت اور مساوات پر مبنی ایک خوشحال اور روشن خیال سماج اور ثقافت کی تشکیل کی خواہش رکھتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام اور ترقی پسند تحریک کے آغاز کا مقصد بھی یہی تھا جب کہ ۹۰،ء۱۹۸۰ء کے بعد سے اب تک بایاں بازو کی جماعتوں کے انتشار اور ''ہندوتو وادی'' جماعتوں کے عروج اور اقتدار کے سبب ملک کے ترقی پسند تخلیق کار اور دانشور ''اجتماعی افادی سماج'' (HolisticSociety) اور فردیاتی سماج Individualistic Society دونوں طرح کے سماج اور ثقافت کے خوابوں کی شکستگی کی منزلوں سے بھی گذر رہے ہیں۔ 'گلوبلائزیشن' اور ''کنزیومرزم'' کے دور میں، عالمی سطح پر اور برصغیر ہندو پاک میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور انسانی سماجوں پر اس کے جو منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کی عکاسی فکشن ،شاعری، تنقید اور مصوری میں جس طرح ہو رہی ہے اس میں عصری مسائل اور حقائق سے متعلق جن 'ڈسکورسیز' اور Narratives کو سمیٹا گیا ہے اس کا تعلق روایتی سکہ بند سرمایہ داریت کی جگہ ،اڈانی ، امبانی کے کارپوریٹ ورلڈ، 'جیو' JIO اور بابا رام دیو کے تیل اور صابن کی زائیدہ سرمایہ دارانہ ''مایا جال'' سے زیادہ ہے۔ (''ہندوتو'' اور ''تہذیبی قومیت' (CulturalNationalism) اس پر مستزاد ہے)۔ اور یہ ''نئی سرمایہ داریت'' سماج کے ہر طبقہ، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن، ضمیر اور روزمرہ کی زندگی کے لئے پیر تسمہ پا بن گئی ہے۔ دوسری جانب ملک میں مذہبی منافرت اور تشدد کے بڑھنے کی وجہ دھرم نہیں، فرقہ

ISSN : 2582 - 3612

وارانہ 'ہٹ دھرمی'، عام جاہلیت اور سیاسی مفاد پرستی ہے ورنہ کسی بھی دھرم کا بنیادی وظیفہ 'نفرت اور تشدد نہیں، بلکہ آپسی محبت و اخوت ہے۔ ملک کے عام ہندو، مسلمان ،سکھ اور عیسائی سبھی ایک پُر امن اور خوشحال سماج چاہتے ہیں جس میں ہر ایک کو بہتر زندگی گذارنے کا موقع ملے۔ ہندوستان کا آئین بھی اس کی ضمانت دیتا ہے۔ ویسے ہمارے سماج میں ابھی بھی جو، رواداری اور روشن خیالی ہے، اس کا تعلق بھی سو فیصد روایتی ''سکہ بند مارکسزم یا ترقی پسندی سے زیادہ نہیں ہے، انفرادی اور اجتماعی زندگی پر روز افزوں بڑھتے ہوئے ''اقتصادی دباؤ'' نے ہر فرقہ کے باشعور لوگوں کو، مسائل اور حقائق کو مذہب کی عینک کی بجائے شکم کی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ 'مذہبی کٹر واد کے متوازی' یہ جو روشن خیالی سامنے آرہی ہے اسے پروفیسر ش اختر کے بقول بجا طور پر ''نئی ترقی پسندی'' کا ہی نام دے سکتے ہیں۔

یہ ''نئی ترقی پسندی'' ایک طرف جہاں مذہبی کٹر پن کی مذمت کرتی ہے وہیں مذہب کے روشن پہلوؤں اور روحانی اقدار کی حمائت بھی کرتی ہے اس ضمن میں اردو شعر و ادب کے حوالے سے پروین کمار اشک ، عرفان صدیقی ،نعمان ہاشمی ،مہتاب حیدر نقوی ، عالم خورشید، خالد بشیر وغیرہ کی شاعری، پیغام آفاقی ،مشرف عالم ذوقی ،غضنفر، حسین الحق ، خالد حسین اور صدیق عالم وغیرہ کے ناول اور افسانے ، اروندھاتی رائے ، نامور سنگھ، عرفان حبیب ، ایم جے اکبر ، اپوروانند، ....سیٹھی ،تولین سنگھ، جاوید اقبال، ڈاکٹر محمد صادق، اور ظہیر انصاری......وغیرہ کی نگارشات دیکھی جا سکتی ہیں۔ مشہور اور معتبر فکشن نگار اور نقاد پروفیسر شین اختر (سابق وائس چانسلر، رانچی یونیورسیٹی) نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسند تنقید'' میں اس نئی ترقی پسندی کے خدوخال کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''نئی ترقی پسندی ایسے اقدار کو آگے بڑھاتی ہے جس کا تعلق انسان دوستی سے ہے دہشت گردی کے تمام حملے، ظلم و تشدد کی تاریخ سے بھری ہے۔ یہ بیرونی طاقتوں کی اجارہ داری اور استحصال پسندانہ معاشی اور سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو عیسائی اور مسلم ممالک میں بانٹ دیا ہے۔ ان کی نظریں تیل کے چشموں سے کشمیر کی خوبصورت وادیوں تک ٹکی ہوئی ہیں۔ نیا ترقی پسند...ظلم و جور اور استحصال دیکھکر خاموش نہیں رہتا۔ وہ ہندوستان کی اقلیتوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھتا ہے اور احتجاج کا نیا طریقہ کار استعمال کرتا ہے۔''

اے وطن، خاکِ وطن، وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بزرگ ترقی پسند نقاد اور دانشور پروفیسر شمین اختر نے ہندوستان کی مسلم اقلیت، اور افرو۔ایشیائی ممالک کے حالات اور ادب و تنقید کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعوے کے ساتھ مزید لکھا ہے :

''نیا ترقی پسند ناقد، مسلم قوم کے مسائل، ان کی خود مختاری، آزادی، انانیت اور تاریخ میں ان کے عظیم الشان کارنامے کو برابر پیش نظر رکھتا ہے۔وہ مسلمان جس کے سر پر ایک ٹوپی ہوتی ہے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور جس کا سر پانچ وقت سجدۂ شکر میں جھک جاتا ہے، وہ یعنی ترقی پسند نقاد اس کا دفاع ہر قدم پر کرتا ہے اور اسے اپنے فکر و فلسفے کا ایک اہم جزو سمجھتا ہے .....لیکن ''بنیاد پرستی'' (Fundamentalism) خواہ وہ اسلامی ہو یا عیسائی یا کوئی اور انسانی سماج اور تہذیب کی دشمن ہے، اس حقیقت سے نیا ترقی پسند ناقد کبھی غافل نہیں رہتا۔''

(نئی ترقی پسند تنقید؛ پروفیسر شمین۔اختر۔ص۔۵۴)

یہاں کہنے کی ضرورت نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں ''اسلام'' کو سب سے زیادہ جدید، سائنٹفک اور ترقی پسند ''ضابطۂ حیات'' تسلیم کیا جاتا ہے۔''اسلام'' دھرم یا Religion کے عام معانی کے برخلاف ایک عالمگیر سماجی وثقافتی نظام'' (UniversalSocio.Cultural Setup) ہے۔ جو عہدِ حاضر کی کشمکش، مسابقت اور انتشار کی صورت حال میں صرف عالم اسلام ہی نہیں پورے عالمِ انسانیت کے لئے راہ نجات کی حیثیت رکھتا ہے۔غلام احمد پرویز مرحوم کے مطابق علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری دنوں میں ایک کتاب لکھ رہے تھے جس کا عنوان ہی Islam is Not a Religion ,but a challange to religion تھا۔کلام پاک میں ہبوطِ آدم کے اسباب اور پھر دنیا میں عروجِ آدمِ خاکی کے امکانات کی نشاندہی کے علاوہ خود رسول کریم کا، فاصلوں اور مسافتوں کی فکر کئے بغیر علم حاصل کرنے پر اصرار (اطلبوا العلم ولو فی الصین؛ علم حاصل کرو خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے) یہ ثابت کرتا ہے کہ دین اسلام کا بنیادی وظیفہ ہی انسان اور انسانیت کے عقل و شعور کا ارتقاء ہے، دنیا کے دوسرے دھرموں میں بھی 'مانو' اور 'مانوتا' کے 'اُدھار' یا ترقی کے ایسے ہی اُپدیش ملتے ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی سماج میں اجتماعی یا 'ساموہک' اُتھان، وکاس، عروج یا ارتقا کے تصور کا ہی دوسرا نام ترقی پسندی ہے۔یہاں ایک اور نکتے کی طرف دھیان دیں۔عام طور پر ترقی پسندی کو مارکس اور اینگلس کے نظریات کی پیداوار مانا جاتا ہے۔یہ بات غلط بھی نہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کہ مارکس کے نظریات کے عام ہونے سے بہت پہلے روس، چیکوسلوواکیہ اور بلغاریہ وغیرہ ملکوں میں ترقی پسند سوچ اور فکر کے گل بوٹے کھلنے لگے تھے۔

ISSN : 2582 - 3612

روسی دانشوروں میں، وِسارین گریگوریوچ بیلینسکی (۱۸۱۱۔۱۸۴۸ء) نے مارکس سے پہلے فن اور زمانہ کے اٹوٹ رشتے کو تو قائم کیا ہی ساتھ ہی فن کی عمدگی اور علویت کی کسوٹی، سماجی مسائل کی پیش کش کو قرار دیا تھا۔حالانکہ بیلینسکی فن کا مقصد جذبہ واحساس کا اظہار ہی مانتے ہیں لیکن وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ فن پارے میں پیش کئے گئے جذبہ واحساس میں تاثیر کی اتنی قوت ہونی چاہئے کہ قارئین اس سے تحریک اور ترغیب حاصل کر سکیں یعنی اس جذبہ یا احساس کا تعلق لازمی طور پر عوامی سماج سے ہونا چاہئے۔بیلینسکی ادب میں 'خیر' کی قدروں کے ساتھ ساتھ 'شر' کی عکاسی کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ ''شر'' کی 'لعنتوں' کو سمجھے بغیر ''خیر'' کی 'برکتوں' کا شعور حاصل نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح اگر چہ اردو میں ترقی پسند تحریک کی باضابطہ ابتدا، ۱۹۳۵،۳۶ء سے ہوتی ہے۔لیکن جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ سوشلزم کی تحریک، انیسویں صدی کے اس استحصالی معاشی اور معاشرتی نظام کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئی جس میں ایک مخصوص طبقہ اپنی سیاسی، سماجی اور معاشی بالا دستی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے کمزور طبقوں کے ساتھ غیر منصفانہ اور بعض حالات میں غیر انسانی سلوک روا رکھے ہوئے تھا۔مارکس کے پیش رو مفکرین نے بھی اس صورت حال کو بدلنے کی خاطر بعض اصلاحی تصورات پیش کئے تھے۔کارل مارکس نے ایسے تمام سابقہ تصورات کے عملی اور اطلاقی امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے، مربوط طور پر ''سائنسی سوشلزم'' کا فلسفہ پیش کیا جسے بعض ترمیم و اضافہ کے ساتھ، دنیا کی اولین اشتراکی مملکت 'سوویت روس' میں نافذ کیا گیا۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے وقت ہندوستان میں برطانوی نو آبادیت سے نجات کی جدوجہد ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھی، لیکن اردو ادیبوں کے یہاں ''سماج وادی سماج'' کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہندوستان میں پڑنے والے بھیانک قحط کے دوران ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز افسران کے غیر انسانی سلوک، اور زمینداری قوانین میں تبدیلی سے لے کر ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال جیسے واقعات کے سبب ایک طرف جہاں جذبہ آزادی کو تحرّک حاصل ہوا وہیں دوسری جانب اردو شعر و ادب میں بھی سماجوادی سوچ اور فکر بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر نمایاں ہونے لگا تھا۔اپریل ۱۹۰۷ء میں ''مخزن'' میں سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' شائع ہوئی۔یلدرم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ادیب اور دانشور تو تھے ہی، انہیں مطالعے کا بھی شوق تھا، قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''سفینۂ غم دل'' میں اس کی تصدیق کی ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ یلدرم نے مارکس کو پڑھا ہو۔اگر نہ پڑھا ہوتا تو ''چڑیا چڑے کی کہانی'' میں ''سماج وادی نظامِ فکر'' کے حامیوں کی طرح ایسی سطریں نہ لکھتے :

'' پھر ان (انسانوں) کے گھونسلوں کا حال سنئے، ایک بڑا ہے، ایک چھوٹا ہے، یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟.....چھوٹے گھونسلے والا انسان، بڑے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

گھونسلے والے انسان کے سامنے سر جھکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، لاحول ولا قوۃ، کس قدر بے غیرت مخلوق ہے۔ میں نہ اپنے ہم جنس کی اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں اور کیوں کروں، خدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں ....اپنے بال بچوں کے سوا کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جا کر دریوزہ گری کرنا عار کی بات ہے، ننگ کی بات ہے، مگر انسان ....وہ مدعی عقل، احمق جو اپنے تئیں درس آموز قدرت خیال کرتا ہے، اس نکتے کو نہیں سمجھتا۔''

اسی طرح ہندوستان میں، انیسویں صدی کے اخیر کے قحط اور برطانوی حکومت کی استعماری پالیسیوں کے سبب ہندوستان معاشی بدحالی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ہندوستانی عوام کی غربت اور قابل رحم معاشی بدحالی کے پیش نظر علامہ اقبال نے ۱۹۰۳ء میں اپنی پہلی تصنیف ''علم الاقتصاد'' میں اپنا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا :

'' ....غریبی یا یوں کہئے کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی انسانی قوی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے....اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ، آیا مفلسی بھی 'نظم عالم' میں ایک لازمی جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔''

(فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، از جگن ناتھ آزاد، ص۔ ۷)

وقت گذرنے کے ساتھ اقبال ترقی پسند یا سوشلسٹ نظام فکر سے اور زیادہ قریب آتے جاتے ہیں اس ضمن میں اقبال کی نظموں، کارل مارکس کی آواز'' ''لینن خدا کے حضور میں، 'سرمایہ و محنت، خضر راہ، اور ''طلوع اسلام ....وغیرہ سے تو ہر شخص واقف ہے۔ 'جاوید نامہ' میں اقبال نے کارل مارکس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی نسل سے بتایا ہے اور پیغمبرِ بے جبرئیل تک کہہ گئے ہیں :

صاحبِ سرمایہ از نسل خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است — قلب او مومن، دماغش کافر است

لیکن سوشلزم اور اشتراکیت سے متعلق اقبال کے نظرئے کو سمجھنے کے لئے اقبال کے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم، حنیف رامے، رفیع الدین ہاشمی اور عزیز احمد کو بھی پڑھنا ہوگا۔ عزیز احمد نے تو 'طلوع اسلام' کو ''اشتراکی اسلام کا طلوع'' قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اس خطبے کو بھی سامنے رکھنا بہتر ہوگا جو انہوں نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسیٹی کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اور جس میں اقبال نے ہندوستان کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی غربت و افلاس کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا تھا :

''... یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمانوں کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابل رحم ہے، شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ، کس نے نہیں دیکھا، لاہور کے کسی اسلامی محلے میں جا نکلو، ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشیں بُڑھیا کی لجاجت آمیز صدا ہوگی جس کی سوکھی اور مُرجھائی ہوئی انگلیاں بُرقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک مُنہہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری، اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔''

(اقبال اور سوشلزم، از ڈاکٹر نذیر احمد شیخ، ص۔ 227)

اردو کے بڑے ناقدین (نارنگ، فاروقی) نے کُھلے طور یہ ماننے کی ایمانداری نہیں دکھائی ہے کہ اردو میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے لئے اقبال راستہ ہموار کر چکے تھے۔ سجاد ظہیر اور سردار جعفری اور محمد علی صدیقی وغیرہ کی تحریوں میں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں اور اگر ۱۹۳۶ء میں اقبال علیل نہ ہوتے اور ترقی پسندوں کی کانفرنس میں پریم چند کی جگہ اقبال نے صدارتی خطبہ دیا ہوتا جیسا کہ کچھ لوگ چاہتے بھی تھے

تو اقبال محض ''حسن کا معیار'' بدلنے کی بات نہیں کرتے بلکہ تحریک آزادی، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات، گول میز کانفرنس کی ناکامی، دوقومی نظریہ، مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کی چپقلش، ''سوراجیہ'' کے اعلان (۱۹۳۰ء.) اور ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل وغیرہ کے حوالے سے ملک وقوم کا مزاج اور مقدر بدلنے کے ضمن میں غالباً زیادہ عملی اور منطقی راستوں کی نشاندہی کرتے، جو وہ یوں بھی اپنی شاعری، خطبات، خطوط اور دیگر نثری تحریروں کے ذریعے ابتدا سے ہی کرتے چلے آرہے تھے۔ کیونکہ اقبال صرف اور محض شعر وادب کے آدمی نہ تھے سماجیات، اقتصادیات، مذہبیات، اور ثقافت کی شناوری کے بھی اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اقبال نے مارکس اور اینگلز کو بہ نظر غائر پڑھا اور سمجھا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مارکس اور اینگلز بھی اسلام اور اسلامی نظریات سے ناواقف نہیں تھے۔ ۲۴ مئی ۱۸۵۳ء. کو اینگلز نے مارکس کو مانچسٹر سے خط لکھا تھا کہ :

'میں نے چارلس فارسٹر نامی پادری کی کتاب ''عرب کا تاریخی جغرافیہ'' پڑھی تو پتہ چلا کہ یہودی بھی ملک عرب کے بدوی قبیلے تھے جن کی نام نہاد مقدس کتاب قدیم عرب کی مذہبی اور قبیلہ وادی روایتوں کی دستاویز کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دوئمش یہ کہ جنوب مغربی خطے کے عرب بھی قدیم زمانے میں اتنے ہی مہذب تھے، جتنے مصری اور اشوری، تیسرے یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسلامی انقلاب بھی دوسری مذہبی تحریکوں کی مانند ایک ردِعمل تھا، آسان معاشرے کے حق میں۔''

(موسیٰ سے مارکس تک۔ سبطِ حسن، ص۔ ۴۱۸)

مارکس اور اینگلز کے گہرے مطالعے کی بنا پر 'مارکسزم'، 'سوشلزم' یا اشتراکیت سے متعلق علامہ اقبال کے تصورات کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر ''انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں نہ آیا ہوتا تب بھی اردو شعر وادب میں 'ترقی پسندی کا عروج ہوتا البتہ اس ترقی پسند ادب میں 'الحاد، دہریت، مادی جدلیات کی تطبیق اور ماکسی معاشی وسماجی نظام کی تبلیغ کے بجائے اسلامی سوشلزم اور اسلامی معاشی نظام کا غلبہ ہوتا۔ ''سورہ آل عمران'' میں انسان کو مادی اور روحانی تقاضوں کا پیکر قرار دیا گیا ہے۔ مارکسی نظام فکر اللہ کے وجود اور روحانیت پر یقین نہیں رکھتا، لیکن مارکسی فلسفہ میں ایسے کئی پہلو ہیں جو اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام سے میل کھاتے ہیں۔ اسی لئے عصر حاضر کے کئی مسلم اور نو مارکسی دانشوروں نے مارکسی نظریات میں زمانہ حال کے مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی تقاضوں کی روشنی میں مارکس کے سماج وادی اور معاشی نظریات میں ترمیم واضافے بھی کئے ہیں اور یہی ''نئی ترقی پسندی کی بنیاد ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس (لکھنؤ ۱۹۳۶ء) میں مولانا حسرت موہانی نے ادب میں ترقی پسند سوچ اور فکر کے حوالے سے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ :

''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے جدید ادب کو 'سوشلزم اور کمیونزم' کی بھی تلقین کرنی چاہئے اور اسے انقلابی ہونا چاہئے'' انھوں نے یہ سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ ''اسلام اور کمیونزم میں قطعی کوئی تضاد نہیں'۔ اُن کے نزدیک 'اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔ اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انہی خیالات کی ترویج کرنی چاہئے............آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔''

(بحوالہ ترقی پسند تحریک (۱۹۳۶ء۔۱۹۸۶ء) ص۔۴۲)

دراصل مارکس پر یہ الزام درست نہیں ہے کہ اس نے صرف ایک معاشی انسان Economic Man کا تصور پیش کیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ''مارکس کے تصور کا انسان محض معاشی انسان نہیں، وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا فطری انسان ہے۔ اس کے اندر بھی ایک فطری انسانی دل دھڑکتا ہے۔ وہ خارجی بے توجہی اور احساس تنہائی کی پیدا کردہ 'بے گانگی' (Alienation) سے آزاد ہوکر صرف فکر معاش میں سرگرداں نہیں رہتا، بلکہ ایک فطری اور عملی انسان کی طرح اپنے پورے معاشرہ اور عالم انسانیت کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لئے بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔ ڈاکٹر رغبت شمیم ملک نے اپنی کتاب ''نقاد کی زبان سے'' میں نامور سنگھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

''مارکس یہ مانتا ہے کہ انسان اگر سرمایہ دارانہ استحصالی ریشہ دوانیوں سے آزاد ہو، تو جیتا جاگتا روشن خیال عملی انسان ہوتا ہے، جس میں اشیا کی اصل حقیقتوں کو دیکھنے، محسوس کرنے، زندگی کے مختلف رنگوں کو پہچاننے کے علاوہ شعر وادب سے اور رنگ ونغمہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ ایسا انسان سنگ وخشت کی طرح، بے حس نہیں ہوتا ہے، وہ پیار بھی کرتا ہے اور غصہ بھی، اس کا دل محبت کے دو بول سن کر بھر آتا ہے، اور نفرت وعداوت کی باتوں پر اس کا دل درد وغم سے مضمحل بھی ہو اٹھتا ہے۔ واقعتاً

مارکس نے ایسے مکمل انسان کے لئے ہی ساری جدوجہد کی تھی.....مارکس
نے انسان کو''جمالیاتی مخلوق'' قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ'انسان
دوسری مخلوقات سے اس بنا پر بھی مختلف اور ممتاز ہے کہ انسان کی جُملہ تعمیری
سرگرمیوں کا دارومدار جمالیاتی اصولوں پر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہی ہے
کہ''جمالیات''خود''مارکسیت'' کے مرکز میں ہے۔''

(نقاد کی زبان سے: ترجمہ۔ڈاکٹر رغبت شمیم ملک،ص۔9,10)

نو مارکسی مفکرین۔(Neo Maxists) ٹیری ایگلٹن، پیری اینڈرسن اور جارج لوکاچ سے لے کر احب حسن، لیزلی فیڈلر، ایڈورڈ سعید، ژولیا کرسٹیوا اور چامسکی تک، اور روسی ہئیت پسندوں RussianFormalists شکلووسکی اور رومن جیکوبسن وغیرہ نے''مارکسی جمالیات'' کی بنیاد پر ہی زبان وادب'Colonialism' اور سماجی وسیاسی بدلاؤ اور انقلاب سے متعلق جتنے اور جیسے بھی نظریات پیش کئے ہیں ان کی غرض وغائت بھی انسان اور انسانی سماج کی اصلاح اور تعمیر وترقی ہی ہے۔آج اکیسویں صدی کے اردو کے اکثر وبیشتر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا کردار بھی محسوس یا نامحسوس طور پر، کسی نہ کسی زاویئے سے ایسے ہی تعمیری سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے اور اگر آج کی ان تحریروں سے ٹپکنے والی سوچ اور فکر کو''نئی ترقی پسندی'' کا نام دیا جائے تو کون ہے جو اسے غلط قرار دے گا؟ لیکن یاد رہے کہ انسان اور انسانی سماج کے کسی بھی متن یا ڈسکورس کو سمجھنے اور سمجھ کر ترقی پسند موڑ دینے کے لئے جذبہ واحساس میں شدت کے ساتھ ساتھ فکر ودانش کی سطح کا بلند ہونا بھی ضروری ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حقائق ومسائل جتنے سنگین ہوتے ہیں، ان کا سامنا کرنے کے لئے اتنے ہی گہرے اور ہمہ جہت شعور کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔مارکس اور اینگلز نے اپنی تصنیف The German Idealogy میں اور مارکس نے A ContributionTo The Critic Of Pilitical Economy میں درست لکھا ہے کہ کسی بھی سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ہمہ جہت غور وفکر سے کام لینا ضروری ہے اور انسان کے غور وفکر کا عمل، انسان کے مادی اور روحانی امتیازات کے باہمی ارتباط سے تعلق رکھتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ 'شعور'، زندگی کے رُخ کا تعین نہیں کرتا بلکہ'زندگی' شعور کی نہج کا تعین کرتی ہے یعنی جس سماج میں انسانی زندگی جس طور پر سامنے آتی ہے اسی کے مطابق سماج کی ترقی کے لئے دانشور فرد یا افراد شعوری طور پر اپنا لائحہ عمل طئے کرتے ہیں۔''جرمن آئیڈیالوجی''(1845) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مارکس اور اینگلز نے یہ تبصرہ غالباً ہندوستان کے حوالے سے کیا تھا۔انہوں نے لکھا ہے کہ :

''ہندوستان میں ذات پات کا نظام اور تقسیم کاری کی نہائت بھونڈی شکل

ISSN : 2582 - 3612

ہے۔'' موسیٰ سے مارکس تک۔ص۵۳.ہندوستانی معیشت پر برطانیہ کی صنعتی
ترقی کس طرح اثر انداز ہوتی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسی کتاب
میں لکھتے ہیں کہ''انگلستان میں اگر کوئی صنعتی مشین ایجاد ہوتی ہے تو بے شمار
ہندوستانی اور چینی دستکار روٹی روزگار سے محروم ہو جاتے ہیں۔انگریز
سرمایہ دار صنعت میں انقلاب لاتا اور ہندوستان کو سیاسی طور پر اپنا غلام بناتا
چلا جا رہا ہے۔''

(بحوالہ۔موسیٰ سے مارکس تک۔از۔سِبطِ حسن،ص۔۴۱۶)

اکیسویں صدی کا ادیب اور شاعر اس سارے پس منظر کا شعور رکھتا ہے، لہذا، ادب کے حوالے سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ترقی یافتہ سماجی شعور اور گہرے احساس جمال کے تخلیقی امتزاج Creative Interaction سے ہی عمدہ ادبی تخلیق وجود میں آتی ہے۔اس بات کو محدود دائرے میں اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ اردو کے سب سے بڑے منطقے برصغیر ہندوپاک میں آج، اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کم وبیش ویسے ہی حالات پیدا ہو گئے ہیں جیسے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یوروپ میں تھے۔ ۱۹۳۳ء.میں جرمنی میں ہٹلر کی قیادت میں سر اٹھانے والی'فاشزم' نے پورے یورپ میں سیاسی بحران اور دہشت وبربریت کا بازار گرم کرنے کے علاوہ دوسری جنگ عظیم کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔نازی جرمنی میں تہذیب وتمدن، ادب وثقافت اور علوم وفنون کی تمام قدریں تہہ وبالا ہونے لگی تھیں ٹامس مان اور ارنسٹ ٹولر جیسے بین الاقوامی شہرت کے مالک ادیب، بہر جیسے آرٹسٹ اور آئن اسٹائن جیسے سائنس داں کو قید وبند اور جلا وطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔کئی سیکولر اور جمہوریت پسند دانشوروں کا خیال ہے کہ'آج کی تاریخ میں ہندوستان میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ہر شخص کو پتہ ہے کہ'فاشزم' کا مقابلہ کرنے کے لئے دنیا بھر کے روشن خیال ادیبوں اور دانشوروں کو بیدار اور متحرک کرنے کے لئے پیرس میں ۱۹۳۴ء.میں جو The Writers For The Defence Of Culture World Conference Of The منعقد کیا گیا تھا۔اس میں روماں رولاں، میکسیم گورکی، آندرے مارلو، اور ہنری باربس وغیرہ نے دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے، عالم انسانیت کے''اجتماعی مفاد'' میں ایک نئے''وژن'' سے کام لیتے ہوئے تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لئے'فاشسٹ اور رجعت پسند قوتوں کے مدمقابل آ جانے اور اپنے فن کو انسان اور انسانیت کے لئے وقف کر دینے کی اپیل کی تھی۔دنیا بھر میں اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں اس پر لبیک کہنے والوں میں اردو کے قلم کار پیش پیش تھے۔جن لوگوں نے ہندوستان میں ترقی پسندی کی بنیاد رکھی یعنی سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم، محمد دین تاثیر، احمد علی اور محمود الظفر، رشید

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

جہاں ،....وغیرہ، ان میں سے سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی بھی باضابطہ ادیب نہیں تھا لیکن سب کے سب نئی سوچ رکھنے والے اپنے وقت کے باشعور محبِ وطن دانشور ضرور تھے ان کا مقصد ادب تخلیق کرنا نہیں تھا، بلکہ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد اور دوسری جنگ عظیم کے آس پاس اپنے ملک ہندوستان کے گلے سے غلامی کا جوا اتارنے کے لئے اپنے ہم وطنوں میں سماجی، سیاسی اور ثقافتی بیداری اور روشن خیالی پیدا کرنا اور برطانوی حکومت کے ''نوآبادیاتی نظام'' کے تحت ہندوستان کی لوٹ اور ہندوستانیوں کے استحصال سے عالمی برادری کو آگاہ کرنا تھا۔ترقی پسندی کے علم بردار ان نوجوان دانشوروں نے عالمی تناظر میں ہندوستان کی غلامی، غربت اور پسماندگی کو دیکھا، پرکھا ساتھ ہی مغربی ممالک کی ترقی کے پس پُشت کارفرما نظریات، حکمتِ عملی اور طرزِ حیات کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا اور پھر ایک مخصوص طرزِ فکر کی داغ بیل رکھی جسے ''ترقی پسندی'' کا نام دیا گیا۔ہندوستان کی جدوجہد آزادی، ترقی پسندی کی 'ہمزاد' تھی۔اور یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ لیکن ان سبھی مغربی تعلیم یافتہ ترقی پسندوں کو اپنی مشرقیت بھی عزیز تھی اور خاکِ وطن کا ہر ذرہ ان کے لئے بھی دیوتا تھا اس لئے ان دانشوروں نے ، سرسید کی تحریک اور خدمات اور حالی اور اقبال کی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ترقی پسند افکار وخیالات کے اظہار کے لئے ادب کو محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ان کا مقصد بھی سرسید اور اقبال کی طرح اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ سے زیادہ ادب کے حوالے سے عوام کے فکر ونظر میں انقلاب پیدا کرنا تھا۔زبان وادب سے انقلاب پیدا کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔کلام اقبال تو اس کی زندہ مثال ہے ہی ژولیا کرسٹوا نے بھی اپنی کتاب Language& Revolution میں اس کی وضاحت کی ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان بنیادگزار ترقی پسندوں کی ادبی تخلیقات میں فن تو قدرے کمزور ہے لیکن فکر بے حد توانا ہے۔پھر بھی ان کی تحریریں، ترقی پسند ادب کے لئے ''سنگ وخشت'' ثابت ہوئیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔سجاد ظہیر نے ''روشنائی میں، اور ڈاکٹر عبدالعلیم ، قمر رئیس، محمد علی صدیقی، محمد حسن، سردار جعفری اور عابد سہیل وغیرہ نے اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔اور بقول پروفیسر محمد حسن، قمر رئیس، سید محمد عقیل اور پروفیسر صادق، اگر ترقی پسند ادب نہ ہوتا تو آج اکیسویں صدی میں بھی شائد قارئین اردو شاعری اور کہانیاں پڑھ کر 'آہ' یا 'واہ' ہی کر رہے تے ہوتے ۔ جوگندر پال نے ترقی پسندوں کے مشہور افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کے بارے میں لکھا ہے :

''انگارے کی کہانیاں ترقی پسندوں کا راست اور بلند بانگ اظہار کرتی ہیں اور اگر چہ فنی اعتبار سے کوئی بہت عمدہ معیار نہیں بنا پائیں تا ہم اس لئے اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ اردو قارئین کو ان کے ذریعے پہلی بار ہم عصر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع فراہم ہوا ......اور یوں اس کی

(انگارے کی موضوعاتی وسعت میں آنے دور کی بعض بڑی کہانیوں کے لئے زمین ہموار ہوتی چلی گئی یا حمد علی کی 'ہماری گلی' منٹو کی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' بیدی کی 'گرہن' غلام عباس کی 'آنندی' احمد ندیم قاسمی کی 'پرمیشر سنگھ' اور اشفاق احمد کی 'گڈریا' کے موضوعاتی تنوع اور ترتیب میں ان جراتوں اور آزادیوں کا بڑا ہاتھ ہے جن کا سماں ترقی پسند ادبی عناصر نے ایک طویل مدت تک پیہم باندھے رکھا۔''

(ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر ص۔۱۴۱)

ویسے ترقی پسندی کا ذکر آتے ہی، ذہن میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' ''ترقی پسند تحریک'' اور اس تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ادب کے حدود وامکانات روشن ہو جاتے ہیں۔لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے پیرس میں ۱۹۳۴ء میں World Congressof theWritersfor theDefene of the Culture میں جس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے سامعین کی حیثیت سے شرکت کی تھی، اس اجلاس میں دنیا بھر کے ادیبوں کے نام ایک اپیل جاری کی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ :

''رفیقان قلم؛ موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجئے۔ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم، اُن طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں جو دولت کے بل پر حکومت کرتی ہیں اور بالآخر 'فاشزم' کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں، اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوموں کا خون چوستی ہیں ۔ دنیا بھر کے محنت کشو، ہم اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیتے ہیں، ہمیں متحد ہو جانا چاہئے۔ہمیں اپنی منتشر صفوں کو مجتمع کرنا چاہئے۔انسانیت خطرے میں ہے اور غیر جانب داری موت ہے۔''

دنیا جانتی ہے کہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے لندن واپس آتے ہی ہم خیال؛ ہندوستانی نوجوانوں سے گفت وشنید کے بعد ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہی ''انجمن ترقی پسند مصنّفین'' کی بنیاد رکھ دی۔اغراض ومقاصد (مینی فیسٹو) تیار کرکے اس کی کاپیاں، لندن سے فارغ التحصیل احباب، احمد علی (الہ باد یونیورسیٹی) یوسف حسین خاں اور سبطِ حسن (حیدرآباد) پروفیسر ہیرین مکرجی (کلکتہ یونیورسیٹی) محمود الظفر (پرنسپل۔ایم۔او۔کالج، امرت سر) اور ان کی اہلیہ رشید جہاں وغیرہ کو بھیج دیں۔اس مینی فیسٹو کو اس دور کے تمام ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس مینی فیسٹو پر دستخط بھی کئے۔ان میں پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عابد

حسین، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھ پوری اور علی عباس حسینی وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد ۱۹۳۵ء میں ہی سجادظہیر ہندوستان چلے آئے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین'' قائم کی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اِلہ باد کے بعد علی گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ میں انجمن کی شاخیں بھی قائم ہوگئیں۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام، اور ۱۹۳۶ء کے لکھنؤ کانفرنس سے لے کر آزادی سے قبل مئی ۱۹۴۲ء میں کُل ہند ترقی پسند مصنّفین کانفرنس، اور آزادی کے بعد ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی کانفرنس سے لے کر ۱۹۸۵ء. میں لندن میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی کانفرنس تک، ترقی پسندوں نے بار بار اس بات پر زور دیا تھا کہ استحصال سے پاک سماج کے قیام کے لئے، عوام کو ایک ساتھ مل کر معیار زندگی کو بڑھانے اور تعلیم وتہذیب وتمدن کے حصول کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ ترقی پسند تحریک کی لندن میں گولڈن جوبلی کانفرنس (۱۹۸۵ء) تک ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا، تاریخی معاشی اور سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ فکری اور نظریاتی مدو جزر سے بھی گذر چکی تھی۔ تقسیم ملک، فسادات، وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری، ہجرت، بے سروسامانی جیسے واقعات وسانحات نے ادب پر جیسے جمود طاری کردیا تھا، یہاں تک کہ حسن عسکری نے ''ادب کی موت'' کا اعلان کردیا تھا۔ سرحد کے دونوں طرف لوگوں کو سنبھلنے میں ذرا وقت لگا پھر بھی ۱۹۵۰،۵۵ء. تک آتے آتے ترقی پسند 'تحریک' تو زوال پذیر ہوتی چلی گئی لیکن نظریاتی طور پر ترقی پسندی نہ صرف زندہ رہی بلکہ ہنگامی نعرہ بازی اور پروپگنڈہ سے دامن جھاڑ کر اس کا عروج ہی ہوا۔ چنانچہ ہر چند کہ ۱۹۶۰ء. کے آس پاس سے اردو ادب پر جدیدیت کے رجحان کی گھنگھور گھٹائیں چھائیں بھی اور برسیں بھی لیکن اس کے باوجود ''ترقی پسندی'' عصری توقعات وتعصّبات، خدشات اور خواہشات کو سمیٹتی ہوئی ذات، زندگی اور زمانہ کی ایک لازمی قدر کے طور پر پھلتی پھولتی ہی رہی۔

دراصل دوسری جنگ عظیم اور اس کی تباہکاریاں، برصغیر میں تقسیم ہند، فسادات، ہجرت اور آزادی کے خوابوں کی شکستگی سے لے کر آج اکیسویں صدی میں سماجی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار کے تشویشناک زوال کے سبب جس طرح پورے ملک میں مذہبی، علاقائی اور ذات پات کی عصبیت پھیل رہی ہے (بلکہ پھیلائی جارہی ہے) اور ہمارے اکثر و بیشتر نام نہاد قومی سیاست داں جس طرح اپنے مفاد کے لئے گھناونے منفی سوچ اور فکر کو ہوا دے رہے ہیں اس کے پیش نظر ہر شخص غالب کی زبان میں یہ کہنے پر مجبور ہے کہ :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک راہ رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں اس صورت حال کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کا مداوا کس طرح کیا جاسکتا ہے اس پر بڑی گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور پروفیسرش۔ اختر نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسندی' میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ دراصل شعر

ISSN : 2582 - 3612

و ادب سے وابستہ بیشتر لوگ سیاسی آدمی نہیں ہوتے (ہو سکتے ہیں) لیکن اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اگر ہم آپ چاہیں بھی تو اپنے ماحول اور ملک کے سیاسی گورکھ دھندوں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ حالات ایسے ہیں کہ انفرادی یا طبقاتی پسند یا ناپسند، حق یا ناحق کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وقت نے ہمیں اس قدر 'صابر' بننے پر مجبور کردیا ہے کہ انتہائی نازک اور حساس معاملوں پر بھی ہم بس اتنا ہی کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں کہ، ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے'' موجودہ حکومت کے کچھ تحفظات ہیں، کچھ مجبوریاں ہیں، ساتھ ہی حکمراں جماعت سے وابستہ کچھ تنگ نظر لوگ خود حکومت کی پالیسی کے خلاف جا کر سماج کو جوڑنے کی نہیں توڑنے کی باتیں بھی کرتے ہیں، ملک کی مسلم اقلیت میں بجا طور پر اس سے ناراضگی بھی ہے۔ پھر بھی موجودہ حکومت، بقول خود، ملک کی ہمہ جہت ترقی یا ''سب کا وکاس'' کے نظرئے کے تحت اور باتوں کے علاوہ جس سماجی اور معاشی ترقی کی حکمت عملی (Economic Growth Strategy) پر عمل پیرا ہے اس پر بھروسہ کرنے کے سوا ہمارے پاس اور کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ اور اگر بھروسہ کرلیں تو ذہن میں یہ سوال بھی ابھرے گا کہ پورے ملک کے وکاس کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت ''سب کا ساتھ'' بھی ضروری ہے۔ (جو ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے) موجودہ حکومت کا یہ نعرہ نہایت پُر کشش ہے، دلوں کو لبھاتا بھی ہے اور کچھ لوگ اس نعرے کو ایک فلسفہ بھی قرار دے رہے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ترقی پسندوں کا پریم چند کا دیا ہوا یہ وظیفہ کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' پہلے ایک نعرہ تھا پھر فلسفہ بن گیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس نعرہ یا فلسفہ کی کامیابی کے لئے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کی خامیوں کو دور کر کے ایک مبنی بر انصاف معاشرے کی تشکیل بھی ضروری ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں مذہبی کٹرپن، فرقہ و اریت، بدعنوانی اور جنسی و اخلاقی جرائم کے واقعات میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے اسے ختم کرنے کے لئے اور باتوں کے علاوہ عصری سیاست، سماجیات، تعلیم اور ادب وثقافت تمام شعبوں میں ایک نئے ترقی پسند شعور کو فروغ دینا ضروری ہے۔ لیکن کیسے؟ اس پر غور و فکر کرنا ہی ترقی پسندی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو فیض احمد فیض، مجروح، جذبی، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور ساحر لدھیانوی کے بعد کی نسل میں شہریار، مظہر امام، وحید اختر،.......وغیرہ شعرا اور قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، رام لال، جیلانی بانو اور خودش. اختر جیسے فکشن نگار سکہ بند ترقی پسند تو نہیں تھے لیکن ان کے یہاں انسان اور انسانیت دوست افکار و خیالات، نعرہ باز ترقی پسندوں سے زیادہ دلنواز اور دل گداز لب و لہجے میں ملتے ہیں اسی طرح آج کے معاصر شاعروں میں سلطان اختر، عبدالاحد ساز، عالم خورشید، فرحت احساس، جمال اویسی،.........وغیرہ شاعروں کے یہاں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں۔ اسی طرح معاصر افسانہ نگاروں میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے مفاہمت اور مزاحمت کے عناصر سے قطع نظر انسان اور انسانیت کے تحفظ اور تعمیر و ترقی کا جو

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

رجحان ملتا ہے اسے نئی ترقی پسندی کا نام دیا جاسکتا ہے مثلاً ایک مردہ سر کی حکایت (ساجد رشید)، صلیب (سلام بن رزاق) صدائے بازگشت (ذکیہ مشہدی) نیو کی اینٹ (حسین الحق)، بوڑھے جاگ سکتے ہیں (مشرف عالمی ذوقی)۔ گنبد کے کبوتر (شوکت حیات)، ٹھہر جانے والا منظر (عبدالصمد)، برے موسم میں (خالد جاوید) جلدی کرو (شفیع مشہدی)، شہر (ترنم ریاض)، نیم پلیٹ (طارق چھتاری)، سنگھار داں (شموئل احمد)، حد کوئی چاہیے عقوبت کے واسطے (لالی چودھری)، یزید (اسلم جمشید پوری) انا کو آنے دو (احمد صغیر)، الزورا (صدیق عالم)، راستے بند ہے (اسرار گاندھی)، ستیہ وان (شہناز رحمٰن) وگیرہ افسانوں میں نئی ترقی پسندی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں ترقی پسندی کے حوالے سے اس حدیث پر غور کیجئے، جس میں اللہ کے رسول نے فرمایا تھا۔

''اِنَ مِن الشعرِحِکمتہً و اِن َ مِنَ البیانِ سِحرا''

(بے شک بعض اشعار حکمت ہیں اور بعض بیان جادو ہیں)

آج کا جینوین ادب وہی ہے جس میں قلب وجگر کو گرمانے والی اثر آفرینی کا جادو بھی ہو اور ذہن وضمیر کو بیدار اور متحرک کرنے والی حکمت بھی۔ شعروادب کے اس روئے کو آپ نئی ترقی پسندی کا نام دیں یا کچھ اور لیکن وقت ایسے ہی ادب کا تقاضہ کر رہا ہے۔

Prof. Quddus Jawed
Ex. Head
Deptt. of Urdu
Central University
Srinagar
Jammu & Kashmir
Mob.- 94190 10472

پروفیسر سید صابر حسن

آتشؔ اور ان کا شاعرانہ مقام

حیدر علی پورا نام اور آتش تخلص تھا۔ ان کے والد علی بخش دلّی کے رہنے والے تھے، لیکن دلی کی بدامنی اور پرآشوب ماحول سے عاجز آکر شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد چلے آئے۔ حیدر علی نے ۱۷۷۸ء میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور ان کے بچپن اور شباب کا زمانہ یہیں بسر ہوا۔

آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں تہذیبی اور ثقافتی ترقی بام عروج پر تھی، چنانچہ لوگوں نے فیض آباد کو خیرآباد کیا اور لکھنؤ میں آکر بسنے لگے تو آتشؔ نے بھی اسی شہر کا رُخ کیا۔ یہیں ان کا ذوقِ شعری پروان چڑھا اور انہوں نے مصحفیؔ کی شاگردی اختیار کی۔ استاد کی صحبت میں ان کے جوہر شاعرانہ نمایاں ہونے لگے۔ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے اتنے مشہور ہوئے کہ مسلم الثبوت تسلیم کئے گئے۔ چونکہ والد ان کی کم سنی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے تھے، اس لئے ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوسکی۔ انہوں نے اپنے ذاتی ذوق سے اور کچھ عربی و فارسی کے مطالعے سے اپنے علم میں اضافہ کیا۔ چونکہ شاعری کا چرچا عام تھا، چنانچہ شاعرانہ ماحول میں مصحفیؔ کی صحبت میں وہ اپنی کانِ طبع سے خوبصورت شعر نکالنے لگے۔

لکھنؤ میں انہوں نے درویشانہ زندگی بڑے شان سے گزاری۔ طبیعت نہایت سادگی پسند تھی، قناعت اور استقامت کا حسین مرقع تھی۔ آتشؔ کی اس زندگی کی تصویر محمد حسین آزاد اپنی تصنیف ''آب حیات'' میں یوں اُتارتے ہیں :

> ''ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں، جس پر کچھ چھپر سایہ کئے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا، اسی پر ایک لنگ باندھے صبر وقناعت کے ساتھ بیٹھے رہے اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا، جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکئے میں بیٹھا ہوتا ہے۔''
>
> (آب حیات، ص۔۳۴۳)

آتش کی اس سادگی پسند طبیعت کے سبب بھی ان کی تخلیقی توانائی روز بہ روز پروان چڑھنے لگی۔ یہ چٹائی اور چھپر کی درویشانہ زندگی نے بھی ان کے اندر صوفیانہ خیالات کو تقویت بخشی، چنانچہ اس قسم کے

خیالات وجذبات کی کیفیتیں ان کے کلام میں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

آتشؔ کی شاعری لکھنؤ کی تہذیبی زندگی سے متاثر نظر آتی ہے اوراس میں ایک لطف خاص کا احساس ہوتا ہے۔آتشؔ کی زندگی کے بیشتر اوقات سپاہیانہ طرز پر بسر ہوئے۔اس طرح زندگی سے انہیں محبت تھی۔ان کا لباس گیروے رنگ کا تہبند تھا۔ہاتھ میں ایک ڈنڈا رہتا جس میں ایک سونے کا چھلا لگا ہوا تھا۔سپاہیانہ زندگی کا ان پر اتنا اثر تھا کہ انہوں نے اپنی ضعیفی تک تلوار باندھ رکھا اوراپنا سپاہیانہ بانکپن نہیں چھوڑا۔نہایت بے فکری اور آزادی کی زندگی بسر کی۔کسی بادشاہ، وزیر یا نواب کی خدمت میں کبھی حاضر نہیں ہوئے اور نہ کبھی ان کی مدح سرائی کی، کیونکہ خوشامدانہ روش ان کے مزاج کے منافی تھی۔

لکھنؤ کی پُر تعیش زندگی نے آتشؔ کی فقیرانہ زندگی کو متاثر ہونے نہیں دیا۔وہ اپنی قلندرانہ زندگی گزارنے میں کامیاب رہے۔لکھنؤ کی عیش پرست تہذیب کے سامنے خواجہ عبداللہ احرار کے خاندان کے اس فرد نے مسند فقیری پر بیٹھ کر نہ صرف اپنی خاندانی بلکہ شمالی ہند کی صوفیانہ روایت کا علم تا دمِ مرگ بلند کئے رکھا۔آرائش وزیبائش کے عناصر لکھنؤ کی تہذیب وشاعری میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ظاہری نمائش ہی یہاں کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔باطنی خوبیوں اور قلبی واردات کی کرشمہ سازیوں سے لکھنؤ کی شاعری خالی ہوچکی تھی۔یہاں حیدر علی آتشؔ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے لفظی مرصع سازی کے ساتھ خالص شاعری کو اپنے تبحر علمی کے جوہر سے چمکایا۔چنانچہ کہتے ہیں ؂

اپنے ہر شعر میں ہے معنی تہہ دار آتشؔ وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

انشاؔ اور جرأتؔ کی شاعری لفظی آرائش اور پُر تصنع زیبائش سے آراستہ ہے اوریہی اس زمانہ میں لکھنؤ کا کمالِ شاعری سمجھا جاتا تھا اور ناسخؔ اس فن شاعری میں سب پر سبقت لے گئے تھے،مگر آتشؔ نے اس لفظی کاریگری سے اپنے دامن شعر کو محفوظ رکھا۔آتشؔ نے لکھنؤ کی اس شعری روایت کو جس میں محض خارجی عناصر کی جلوہ گری تھی، داخلی رنگ سے حسن بخشا اوراس طرح لکھنؤ کی شاعرانہ روایت میں زندگی کی سچی علامتیں داخل کیں اور خارجی وداخلی عناصر کی آمیزش سے ایک کامیاب تجربہ کیا۔میر حسنؔ اور مصحفیؔ نے جو خالص شاعری کے خوشنما پودے لگائے تھے اس چمن شعر کو آتشؔ نے ایک خوبصورت اور شاداب چمن میں تبدیل کردیا۔

میرؔ، دردؔ اور مصحفیؔ میں یاس، درد وغم کی کیفیت پائی جاتی ہے،لیکن آتشؔ کی رجائی شاعری میں درد والم،حرماں نصیبی، رنج وغم، ہجر وفراق کی کیفیتیں بہت کم ملتی ہیں۔وہ معشوق کی کجروی وبے وفائی سے اپنے رنج وغم کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ وصل یار کی لذتوں سے محظوظ اور شادکام ہوتے ہیں،مگر یہ منزل حد سے تجاوز نہیں کرتی بلکہ ادب ملحوظ خاطر رہتا ہے۔وصل محبوب سے لطف اندوز ہونا ان کے ہمعصر شعرا میں بھی

خوب پایا جاتا تھا،مگر وہاں ادب کی ساری حدیں ختم ہوجاتی تھیں اور محبوب سے کھیل کھیلنے کا یہ معاملہ ان کو رکیک اور مبتذل حرکتوں پر آمادہ کرتا تھا جس سے شاعری کی تہذیبی وجمالیاتی روح مجروح ہوتی تھی۔اس کے برعکس آتشؔ کی شاعری میں تہذیبی وجمالیاتی روح میں مزید حُسن کا اضافہ ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکیزہ جذبات اور خوبصورت خیالات ان کے اشعار میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔وہ خود کہتے ہیں ؂

صفا بندش ہے ، معنی خوبصورت شعر آتشؔ ہلادیں دل نہ کیوں

آتشؔ کی غزل میں سرمستی اور سرور وانبساط کا ماحول قائم ہے جو کہ ذاتی رنگ سے عبارت ہے۔آتشؔ نے جو سادگی اور قناعت کی زندگی اختیار کی تھی، وہاں مادی خواہشیں تقریباً معدوم ہوچکی تھیں۔زندگی کو نہایت معمولی طرز پر گزارنے کے سبب دنیاوی محرومیوں کی تکلیف سے وہ مبرا ہوچکے تھے، چنانچہ ان کی خواہشیں کبھی بغاوت پر آمادہ نہیں ہوئیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں رجائیت کا آہنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔آتشؔ کی ایک خوبصورت غزل کے دو اشعار دیکھئے جو کہ وصل ونشاط کی پر کیف و پر بہار کیفیتوں سے سرشار ہے ؂

شب وصل تھی ، چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا ، خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی سحر تک مہہ و مشتری کا ، قراں تھا

وصل محبوب کی مسرت میں آتشؔ کے یہاں جو طرب انگیز پہلو اُجاگر ہوتے ہیں وہ جنسی احساسات کی خوبصورت مثالیں پیش کرتے ہیں۔آتشؔ محبوب سے قربت کے متمنی ہیں، مگر وصل یار کی خواہش میں وحشت ودیوانگی سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر آتشؔ کے شعری کمالات پر یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں :

''آتشؔ کی زندگی میں ان کی جتنی عزت تھی، آج اس میں زیادہ اضافہ ہوچکا ہے۔لکھنؤ کے انحطاط پذیر معاشرہ نے ان کے وقت تک گدلے پانی جیسی صورت اختیار کرلی تھی، لیکن آتشؔ اس میں کنول کی طرح عفت جذبات کی علامت بن جاتے ہیں۔جنس پرستی کے اس لکھنؤ میں آتشؔ کا کلام کسی لکھنوی بانکے کا نہیں بلکہ دلی والے کا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ دلی والا، دردؔ یا میرؔ کے لب ولہجہ کی بات کرنے کی بجائے نشاطیہ لے میں گیت گاتا ملتا ہے،اسی لئے آتشؔ جسم کی دلدل میں نہ پھنسے حالانکہ جسم ان کے کلام میں بھی ہے۔قوت اور توانائی کا اظہار اور رجائی رویہ ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔''

(اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،ص۔۲۰۵)

ڈاکٹر سید اعجاز حسین آتش کے کلام کی خوبیوں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :

''روز مرہ اور بول چال کا لطف آتش کے کلام میں بے حد مزا پیدا کرتا ہے، رنگینی شوخی ان کے کلام کی دلکشی کو دوبالا کرتی ہے اور پھر اس پر لطف یہ کہ اختصار کے ساتھ مضمون ادا ہوتا ہے جو سونے میں سہاگے کا کام کرتا ہے۔''

(مختصر تاریخ ادب اردو، ص۔۸۵)

آتش نادر تشبیہوں اور خوبصورت استعاروں کے استعمال میں بھی بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مسلسل عاشقانہ غزل کے چند اشعار دیکھیے ؎

سن تو جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
طبل و علم ہے پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتش کی غزلوں میں عاشقانہ رنگ بڑا چوکھا اور دل پذیر ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں عارفانہ رنگ بھی ہے۔ ذاتِ حقیقی میں ضم ہو جانے کی تمنا صوفیانہ شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ اس قسم کے خیالات ان کے اشعار میں تسلسل کے ساتھ قائم ہیں۔ اسی طرح وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا تصور بھی آتش کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کے یہاں روح کی بے قراری کا تصور بھی موجود ہے جہاں روح عالم مجازی کے قیام میں بے چینی محسوس کرتی ہے اور قفس عنصری سے نکل کر خالق حقیقی کی ذات میں مدغم ہونے کے لئے تڑپتی اور منتظر رہتی ہے۔

آتش کی صوفیانہ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ امیر خسرو، بیدل اور مظہر جانِ جاناں جیسے صوفی شعرا کے فارسی کلام کے مقابلے میں اگرچہ کمتر درجے کی ہے کیونکہ اس قسم کی شاعری میں زور و اثر پیدا کرنے کے لئے جس سوز و گداز، محویت اور رقت قلبی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ آتش کے مزاج اور جذبات سے پرے ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

آتش کی غزلوں میں لفظوں کی ایک فطری روانی ہے اور اُن کی آواز میں ایک آہنگ فطری تسلسل کے ساتھ پایا جاتا ہے جس سے صوتی تاثر پیدا ہوتا ہے اور آتش کی قوت تخلیق کو اس سے جلا ملتی ہے ؎

ہوائے دور مے خوش گوار راہ میں ہے خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

آتش کے یہاں خودستائی اور تعلّی کے جذبے بھی پائے جاتے ہیں جس سے ان کی تنقیدی بالغ النظری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
شعر گوئی میں مری طبع کو ہے دقت پسند خشک دولب ہوں تو اک مصرع تر پیدا ہو

فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال

آتش کی غزل میں شراب کی لذت بھی محسوس ہوتی ہے۔ سودا، میر، درد اور مصحفی نے اس موضوع پر جو غزلیں کہی ہیں، اس میں ان کے تخلیقی کمالات سے زیادہ روایت کا پاس ہے۔ صرف میر کے یہاں ان کے تجربات کی گرمی ملتی ہے، مگر آتش کے یہاں شراب ان کی شخصیت کا مجموعی تجربہ ہے۔ شراب سے متعلق ان کے اشعار ان کے رندانہ مزاج کی غمازی کرتے ہیں، کیونکہ زندگی میں وہ مسرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ زندگی سے متعلق آتش کا یہ رجائی پہلو شراب سے سرشار کیفیت سے لطف اندوز کرتا ہے اور یہاں انہیں وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو وہ وصل محبوب کی نشاط انگیز فضا میں محسوس کرتے ہیں۔ موسم گل، ساقی، طاقِ میخانہ، شراب ارغوانی، بادۂ گل گوں اور مئے گلنار کی مثالوں سے ان کی غزلوں میں ایک مسحور کن نشیلی فضا کا احساس ہوتا ہے۔

ان کی شاعری شراب کے کیف و سرور اور محفل نشاط کی کیفیت پیش کرتی ہے۔ ان کے یہ مجازی تصورات محدود پیمانے کے ہیں اور ان کے تجربے ارضی زندگی کی مسرتوں اور راحتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

باغ سے باد بہاری کی ہے آمد آمد طاقِ مئے خانہ سے ہے ساغر مینا اترا
بحرِ غم سے پار اتارے گی ہمیں کشتی مے بادباں ابر اور ساقی ناخدا ہو جائے گا
وہ بادہ کش ہوں میری آوازِ پا کو سن کر شیشوں نے سر حضور ساغر جھکا دیے ہیں
موسم گل کی ہوا چلتی ہے ساقی جام بھر شیشے میں تا چند رکھے گا مئے گلنار کو

آتش اپنی زندگی کا ایک طویل اور کامیاب تخلیقی سفر طے کرنے کے بعد ۱۸۴۷ء میں اس رنگ و بو کی دنیا سے رخصت ہوئے۔

Prof. Syed Sabir Hasan
Ex. Professor
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)
Mob.- 98016 59311

غضنفر

علی گڑھ فکشن کے پانچ رنگ

ہر شام، شامِ مصر اور ہر شب، شبِ شیراز والی علمی فضاؤں میں اُمید کی خوشی والے فسوں ساز نے ایسا فسوں پھونکا کہ سرزمینِ سرسیدی سے سرسبز شعری گل بوٹوں کے ساتھ ساتھ شگفتہ و شاداب افسانوی پودے بھی لہلہا اٹھے۔ خوش رنگ تخلیقی خوشے دور دور تک اپنی نیرنگیاں بکھیرتے چلے گئے۔

اس جادوگر کی پھونک نے اس زمین کو ایسا زرخیز اور پُر تاثیر بنا دیا کہ اس کی مٹی سے کمزور دانے بھی توانا پود بن کر نکلنے لگے۔ اس ساحرِ وقت کی منتر میں جانے کیا سرِّ نمو مضمر تھا کہ زرخیزی میں کبھی کمی نہیں آئی۔ قوتِ روئیدگی ہمیشہ نمو پذیر ہوتی رہی۔ ہر دور اور ہر موسم میں تخلیقی سبزے اُگتے رہے، افسانوی خوشے لہراتے رہے۔

آپ نے پرچوں کے لہراتے ہوئے پرچموں میں بہت سارے عکس دیکھ لیے ہوں گے اور آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سرزمین سرسید نے کتنی افسانوی فصلیں اُگائیں اور ان فصلوں کی شاخوں پر کیسی کیسی خوش نما بالیاں لہرائیں، اس لیے میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اپنی اس مختصر سی تحریر میں بس اس عہد کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کروں گا جس میں بیک وقت پانچ پانچ فکشن نگار پروان چڑھے۔

ایک وقت، ایک ماحول، ایک زبان، ایک صنف اور ایک استاد کے پانچ فن کار مگر پانچوں ایک دوسرے سے مختلف۔ ہر ایک کا رنگ جدا، ڈھنگ جدا، آہنگ جدا۔ ہر ایک کی زبان الگ، ہر ایک کا بیان الگ، ہر ایک کی داستان الگ۔ ایک ایک کا موضوع و مواد منفرد، منشا و مراد منفرد، طبع کی اُفتاد منفرد۔ ہر ایک کا اپنا امتیاز، اپنا اختصاص، اپنا انفراد۔ کسی کی تحریر میں پیتل کا رنگ نہیں، گھنٹے کا آہنگ نہیں، اسلوبیاتی ترنگ نہیں، کسی میں تاریخی کردار نہیں، کسی میں جاگیردار نہیں، کسی میں زمین دارانہ کاروبار نہیں، کسی میں تیغ و سناں کی جھنکار نہیں، کوئی ولید نہیں، کوئی شکوہ نہیں، کوئی ایوبی نہیں۔ ان سب کا معاصر معاشرے سے سروکار ہے۔ سب کی صداؤں میں وقت کی پکار ہے۔ عہدِ حاضر کے جبر و تشدد کا اظہار ہے۔ اشرف ڈار سے بچھڑے انسانی پرندوں کا کرب اور لکڑ بگھے کے ہنسنے، رونے اور چپ ہو جانے کا سبب بیان کرتے ہیں۔ پیغام معاشرے کی

زمین کے نیچے بچھے فلیتے اور اس کے دھماکے سے اڑنے والے انسانی جسموں کے پرخچوں کے کربناک مناظر سامنے لاتے ہیں۔ ابن کنول تیسری دنیا کے لوگوں کے خط و خال، ان کے حال چال اور زندگی پائمال کی عکاسی کرتے ہیں۔ طارق اس لکیر کو دکھاتے ہیں جو کھنچتی ہے تو دماغوں کی نسیں کھنچ جاتی ہیں۔ سینہ شق ہو جاتا ہے دل میں گڈھے پڑ جاتے ہیں اور غضنفر دیوی سرسوتی کی بے حرمتی اور لکشمی اور درگا کی پرستش سے رونما ہونے والی صورت حال اور اس سے مچنے والی تباہی کا قصہ سناتے ہیں اور ساتھ ہی معاشرے کے سمندر کو متھ کر وِش نکالتے ہیں۔ اردو فکشن میں سب کا اپنا اپنا حصہ ہے۔ مکان میں بے گھری اور دربدری کے کرب کی روداد ہے تو باغ کا دروازہ تنگ نظری سے تاراج ہو جانے والے ملک و قوم کا قصہ ہے۔ نمبر دار کا نیلا دہشت گردی کی ہولناکیوں کا ترجمان ہے تو پانی منبعِ آب پر قصۂ نہنگ کے سبب بھڑکنے والی پیاس اور تڑپنے والے پیاسوں کی داستان ہے اور ہمارا تمہارا خدا بادشاہ سیاسی پینترے بازی اور انسانی بے بسی کا داستانوی بیان۔ یہاں تک کہ ان فن کاروں کی کہانیوں میں آنے والے جانور بھی مختلف ہیں۔ سید محمد اشرف کے یہاں نیلا ہے تو طارق چھتاری کے پاس گھوڑا۔ پیغام آفاقی کے یہاں لوہے کا جانور ہے تو ابن کنول کے پاس بھیڑیا اور غضنفر کے یہاں مگر مچھ۔ یہ سارے جانور اپنی ہیئت، سرشت اور معنویت سب میں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کے کردار بھی مختلف ہیں۔ نیلے کی نیلی آنکھیں، مگر مچھ کی سرخ زبان، لوہے کے جانور کے سیاہ پنجے، گھوڑے کے برق رفتار سم اور بھیڑیے کے نکیلے دانت الگ الگ کردار نبھاتے ہیں۔ الگ الگ دنیاؤں میں لے جاتے ہیں۔ الگ الگ منظر دکھاتے ہیں۔ ہر ایک کا طرزِ اظہار بھی جداگانہ ہے۔ الگ الگ ہدف ہے، الگ الگ نشانہ ہے۔ اشرف کی زبان تہذیبی و ثقافتی امور پر نظر رکھتی ہے اور شائستگی، شستگی اور شگفتگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ مثلاً :

> ''ککیّا اینٹ کی سفید عمارت کی دیواریں، ناقابل عبور حد تک اونچی نہیں تھیں۔ ان میں جگہ جگہ در دریچے اور روشن دان تھے اور ان سے آتی ہوئی ہو، حق کی پُراسرار گونج دار آوازیں بازار میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر ایسا لگتا جیسے ان آوازوں کے جسم ہوں اور ان جسموں پر دراز سفید ریشم جیسی داڑھیاں ہوں اور کانوں سے نیچے تک کھیلتی ہوئی نرم نرم کاکلیں ہوں۔ ان آوازوں کو سن کر ایک ایسے سکون کا احساس ہوتا جو سخت تالو میں کوسوں کا سفر پا پیادہ طے کرنے کے بعد ٹھنڈی صراحی کا سوندھا سوندھا پانی سیر ہو کر پینے پر ملتا ہے۔ نیچی نیچی دیواروں والی اس نورانی عمارت کو چاروں طرف سے ستونوں، برجیوں، میناروں اور پھاٹکوں نے گھیر رکھا تھا جو بظاہر کسی محل کی

موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔‘‘

طارق کی لسانی طرز منظری اسلوب بناتی ہے اور بیان کو منظر اور پیکر میں بدل دیتی ہے۔ جیسے :

> ’’وہ اگلے شہر میں داخل ہوا تو اس کی ماں کی آخری نشانی سونے کی ایک موٹی زنجیر اس کے گلے سے کھل کر پیروں کی طرف سرکی، رکاب بنی اور وہ کود کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ٹراٹ — گیلپ اور پھر باگ اتنی ڈھیلی کر دی گئی کہ گھوڑے کی نعلیں گھس گئیں اور چاروں پیر زخمی ہو گئے۔ پہاڑی راستوں پر لگی کائی اور گھوڑے کے پھسلنے کا خوف۔ وہ اترا اور لگام کا کڑا پکڑ کر دوڑنے لگا۔‘‘

ابن کنول کی نگارش، داستانوی رنگ دکھاتی ہے اور مرصع و مسجع آہنگ سناتی ہے جیسا کہ ان کی اس عبارت میں سنائی دیتی ہے :

> ’’اچانک آفتاب کی تیز شعاعیں مانند پیکاں اس کی نگاہوں سے اتر کر پورے جسم میں پھیل گئیں اور اس کا بدن مثل بدرِ منیر پر نور آئینہ بن گیا۔ اس کے اعضائے بدن سے کرنیں پھوٹنے لگیں۔ کئی برس تک مسلسل قطرہ قطرہ آفتاب اسی کے بدن میں اترا تھا جس نے اس کے قلبِ تاریک کو کوہِ نور میں بدل دیا تھا۔‘‘

جبکہ پیغام آفاقی کی زبان شفاف اور سفاک بیانیہ کی مثال پیش کرتی ہے اور اکثر خود کلامی کا انداز اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً :

> ’’یہ بیسویں صدی کی نویں دہائی کی دلّی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں کب رات ہوتی ہے اور کب دن نکلتا ہے، پتا نہیں چلتا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں ہر انسان اپنی حفاظت کا آپ ہی ذمّے دار ہے۔ یہاں بھروسوں کی تجارت ہوتی ہے۔ یہاں معاہدہ بنانے والے ایک ایک لفظ کے ہزاروں ہزاروں روپے لیتے ہیں اور اس شہر میں تم بھروسوں پر چل رہی ہو۔‘‘

اور غضنفر کا طریقۂ کار اشاراتی و استعاراتی ہے جس میں وہ تلمیح اور استعارات سے بھی کام لیتے ہیں، جیسے :

> ’’بچے کی ماں پانی کی تلاش میں اس پہاڑی سے اس پہاڑی پر بھٹکتی پھر رہی تھی اور اب بچے کی ایڑیوں کے پاس سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ بے نظیر کو بھی اپنی ایڑیوں کے پاس پھوٹتا ہوا چشمہ محسوس ہوا۔ نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔

> آسمان جس نے یوسف کو کنویں سے نکالا، عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کیا اور پالا، ابراہیم کو آگ کی لپٹوں سے بچایا، یونس کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا، کرشن کو کنس کی قید سے آزاد کرایا، موسیٰ کو دشمن کے ہاتھوں پروان چڑھایا، لیکن آسمان خاموش رہا۔‘‘

ان پانچوں فن کاروں کے امتیازات اور ان کی منفرد شناخت کا سبب ان کی انفرادیت اور تخلیقیت تو ہے ہی اس تربیت گاہ کا وہ تربیتی رویہ بھی ہے جو وہ دورانِ تربیت روا رکھتا ہے۔ طالب علموں پر وہ ادارہ اپنی تہذیبی رنگ اس طرح چڑھاتا ہے کہ ان کا اپنا رنگ بھی برقرار رہے۔ ایسی ترکیبیں کرتا ہے کہ اس کا روغن تو روشن ہو مگر طلبہ کا انفرادی رنگ مدھم نہ پڑے۔ جہاں وہ اپنے ادارے کی تہذیب کا مبلّغ اور معلّم ہوتا ہے وہیں طلبہ کے تشخص کا امین ہونے کا فرض بھی نبھاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ادارہ طلبہ کو پوری طرح اپنے رنگ میں نہیں رنگ پاتا۔ آپ اگر ان تخلیق کاروں کی تحریروں کو غور سے پڑھیں تو ادارے کا رنگ بھی خاصا چوکھا نظر آئے گا۔ ان میں شائستگی، شستگی، درستگی، بے ساختگی، برجستگی، شگفتگی، درمندی اور انسان دوستی کا جو عکس نظر آتا ہے یہ اسی ادارے کے تہذیبی رنگ کا فوکس ہے۔

کچھ لوگوں کو اکثر یہ سبب جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک قصباتی علاقے میں واقع ادارہ جس کا کیمپس بھی کوئی زیادہ بڑا نہیں، میں تعلیم پانے والے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں اتنی وسعت اور تنوع کیوں کر ہے؟ ان کی بصیرت میں اتنی اور ایسی تیز روشنی کہاں سے آ گئی، تو ان کے تجسس کو مٹانے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ سارے فن کار کیمپس کے بوم کلب سے وابستہ رہے اور بوم ہونے کا ثبوت بھی دیتے رہے۔ بوم جو راتوں کو جاگتے ہیں اور ظلمت میں روشنی پاتے ہیں۔ جو اگرچہ چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتے ہیں مگر ان کمروں میں موہن راکیش کے اندھیرے بند کمرے کھلتے ہیں اور دلوں کی سیاہی چمک اٹھتی ہے۔ رینو کا میلا آنچل لہراتا ہے اور ایک بہت بڑے علاقے کی بے شمار زندگیوں کے داغ دھبّے سامنے آ جاتے ہیں۔ یشپال کی تخلیقی کھڑکی کھلتی ہے اور منش کے روپ کی مختلف صورتیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ سفید خون سے پردہ ہٹتا ہے اور پنجاب کا سیاہ رنگ جھانکنے لگتا ہے۔ اوراقِ کملیشورا لٹتے ہیں اور کھوئی ہوئی دشا میں مل جاتی ہیں۔ بھبھانی بھٹا چاریہ کی دلدل سامنے آتی ہے اور اس میں دھنسا ہوا ایک عالم دکھائی دے جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بوموں کی آنکھوں میں ہمنگ دے کے ’دی اولڈ مین اینڈ سی‘ کے حالات، کامو کے بیگانہ کی کربناک کیفیات، اور پلیگ کے واقعات، ترگنیف کے باپ بیٹے کے درمیان ہونے والے تصادمات کا فکا کے دی ٹرائل کی کشاکش کے معاملات، دستووسکی کے ایڈیٹ کے حرکات و سکنات، کیسر وارڈ کے ناسور جرم و سزا کے داؤ پیچ، جنگ اور امن کے حربے، قلب ماہیت کی کایا پلٹ، سبھی کچھ ابھر آتا ہے۔ سارا جہان

ایک چھوٹے سے کمرے میں سمٹ آتا ہے۔ آؤٹ سائڈر بھی ان سائڈر ہو جاتا ہے۔ گویا ان کا کمرہ جامِ جمشید بن جاتا ہے اور یہ یوم جب شب تاریک میں کیفے ڈی فوس، چار منار، لیلیٰ، ٹی ہاؤس جیسے سرِ راہی چائے خانوں میں بیٹھتے تو بیٹھے بٹھائے انھیں آدابِ سحر گاہی آ جاتے۔ پیالیوں میں شکر کے ساتھ دنیا جہان کی کڑواہٹیں بھی گھل جاتیں۔ چائے سے اٹھنے والی بھاپ میں کھولتے ہوئے سمندروں کا جوش ابلنے لگتا۔ سگریٹوں کے مرغولوں میں کائنات رقص کرنے لگتی۔ اندرونِ ذات سے جھنکاریں نکلنے لگتیں۔ ایک دوسرے کے مشاہدات، مطالعات، تجربات اور محسوسات و خیالات آپس میں مل کر ان کی سوچ کے دائرے کو اتنا بڑا کر دیتے کہ فکر کا کینوس پھیل کر ساری دنیا پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ خارج سے نور اور باطن سے رنگ حاصل کر کے افسانوی دھنک بناتے اور اسے آسمانِ ادب پر تان دیتے۔

Ghazanfar
"Bushra"
Lane A-12
Hamza Colony
New Sir Syed Nagar
Aligarh (UP)
Mob.- 76784 36704

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا عصری منظر نامہ

صحافت کا تعلق سماجی، سیاسی، نفسیاتی، جذباتی اور روز مرہ زندگی میں رونما ہونے والے اُن حالات و واقعات اور حادثات سے ہوتا ہے جن سے ہمیں صحافت آگاہ کرتی ہے۔ گویا صحافت ایک طرح سے سماج کی آئینہ داری کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ یہاں ادب اور صحافت کا رشتہ اگر چہ ایک حد تک مربوط کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ادب ایک الگ دنیا ہے اور صحافت کی اپنی دُنیا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ادب کو صحافت کی ضرورت نہیں ہوتی جب کہ صحافت کو ادبی قدروں کے تابع رہنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی داغ بیل سدا سکھ لال۔ ایڈیٹر ''جام جہاں نما'' اور ''دہلی اردو اخبار'' کے مدیر مولوی محمد باقر وغیرہ کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اُن کے بعد جو صحافی گزرے ہیں اُن میں منشی نول کشور، منشی محبوب عالم، سرسید احمد خان، عبدالحلیم شرر، تاجور نجیب آبادی، منشی سجاد حسین، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، راشد الخیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا محمد علی جوہر، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، اعجاز احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل اور حیات اللہ انصاری وغیرہ ایسے کامیاب اور دیدہ ور صحافی گزرے ہیں جو صحافت کے ساتھ زبان و ادب میں بھی یکتائے روزگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صحافت، ایک غیر جانبدارانہ عمل ہے کہ جس کے تحت ایک صحافی ظلم و جبر اور اُن تکلیفوں کو پیش کرتا ہے جن کا تعلق عوام کی زندگیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا نقلی چہروں کے بدلے اصلی چہرے دکھانے کی ذمہ داری صحافی پر عائد ہوتی ہے۔ وہ بے باک، حق پرست، خوددار ہونا چاہیے اور کسی بھی مصلحت پسندی سے کام نہ لیتا ہو۔ اخبار ''پرتاپ'' کے مدیر مہاشہ کرشن نے صحافت سے متعلق دل کو چھو جانے والا نظریہ یوں پیش کیا ہے :

> ''اخبار نویس یا خبر فروش ایک عام دکان دار کی طرح نہیں ہوتا ہے۔ اُس کا خبریں بیچنے کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کاز کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے۔ اُس پر جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کی ذمہ داری ہوتی

ہے۔اُسے ہمیشہ مجبور ومقہور کی ترجمانی کرنی چاہیے اورضرورت پڑنے پر
اُسے اپناسب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔اُس کا فرض ہے
کہ وہ عوام کی تکلیفیں بیان کرے اوراُن تکلیفوں کی نمائندگی کرے اور اگر
حکومت ان پر توجہ نہ دے تو حکومت کے خلاف جد وجہد کا بگل بجادے''
(مشمولہ،اکیسویں صدی میں اردوصحافت۔ڈاکٹر امام اعظم،ص۔160)

جموں وکشمیر میں اردوصحافت کا عصری منظر نامہ بیان کرنے سے پہلے یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ یہاں اردوصحافت کی شروعات کب اور کن ہاتھوں سے ہوئی۔اس اعتبار سے دیکھیں تو جموں وکشمیر میں اردوصحافت کا سفرایک سو چھیاسٹھ سال کے طویل مدت پر محیط ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے 1867ء میں جب ایک ادبی تنظیم قائم کی تو اُس کا نام ''بدیا بلاس سبھا'' رکھا جس کے تحت مہاراجہ ادبی محفلیں منعقد کرواتا تھا۔ اس سبھا کا اپنا ترجمان ایک ہفت روزہ کی صورت میں شائع ہونے لگا جس کا نام ''بدیا بلاس'' رکھا گیا۔جموں و کشمیر کا یہ پہلا اخبار سمجھا جاتا ہے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا لیکن 1885ء میں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات ہوگئی تو یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔لیکن اس کے باوجود جموں میں مہاجن سبھا نے'' ڈوگرہ گزٹ'' کے نام سے اپنا ایک اخبار جاری کیا جس میں سماجی اور مذہبی اصلاح کے مضامین ہوتے تھے۔ یہ 1906ء تا1916ء کے وسط کا زمانہ تھا۔

محمد الدّین فوق ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے کہ جنھوں نے سب سے پہلے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے راج دربار میں یہ درخواست پیش کی کہ انھیں ریاست میں ''کشمیر میگزین'' جاری کرنے کی اجازت دی جائے مگر پرتاپ سنگھ نے اُن کی عرضی نظر انداز کردی۔قلم کار چونکہ نہایت حساس ہوتے ہیں چنانچہ کشمیری قلم کاروں نے ریاست سے باہر کے اخبارات میں کشمیری عوام کے مسائل ومشکلات کو مستقل طور پر لکھنا شروع کیا۔لاہور اور دوسری جگہوں سے کشمیری عوام کی حالت زار اوراُن پر ظلم وستم کی مار کا حال جن اخبارات میں شائع ہوتا تھا اُن میں مرثیہ کشمیر،اخبار عام ،خیر خواہ کشمیر،ہمدرد،تحفۂ کشمیر،کشمیر درپن،راجپوت گزٹ،کشمیری میگزین،اخبارکشمیر،مظلوم کشمیر،پنجابی فولاد اور صبح کشمیر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لالہ ملک راج صراف کا نام زبان پر آتے ہی جموں میں اردوصحافت کے شاندار ابتدائی دور کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ملک راج صراف سانبہ کے رہنے والے تھے۔وہ ایک بے باک ،اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باہمت صحافی کے طور پر تقریباً پچاس برس تک اردوصحافت کی خدمت کرتے رہے۔24 جون 1924ء کو انھوں نے اپنا اردو اخبار ''رنبیر'' کے نام سے جاری کیا جس کے سبب ریاستی قلم کاروں کی ایک کہکشاں بھی

سامنے آئی۔اس اخبار میں جن قلم کاروں کی شمولیت رہی اُن میں وشوا ناتھ کیرنی،ذوالفقار علی نسیم،حبیب اللہ، شری رام ،بدری ناتھ وکیل،گردھاری لال آنند،ایس۔ایس۔نشاط،سورن ناتھ آفتاب،پریم ناتھ سادھو رونق،ارجن سنگھ عرش،بنسی لال سوری،منوہر لال دل،متھرا داس شائق،مرزا مبارک بیگ ،ماسٹر زندہ لال کول،غلام حیدر،صاحب زادہ محمد عمر،محی الدّین احمد گمان اور پنڈت نند لال طالب قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ اہل قلم تھے جنھوں نے شخصی راج کے ظلم وستم،زبردستیوں اور حق تلفیوں کو صحافت کے حوالے کیا۔

جولائی 1933ء میں جموں سے ''پاسبان'' نام کا ایک اخبار منشی معراج الدّین نے شائع کیا جو جموں خطے کے مسلمانوں کے احساسات وجذبات کے اظہار کا وسیلہ ثابت ہوا۔اسی طرح 1932ء میں کشمیر میں سب سے پہلے بریم ناتھ بزاز نے'' وتستا'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جسے کشمیر کا پہلا اخبار تصور کیا جاتا ہے۔''وتستا'' نے دوسرے اخبارات کے لئے مہمیز کا کام کیا، دیکھتے دیکھتے ہمدرد، مارتنڈ، خدمت،خالد،نُور اور دیش نے صحافت کا ماحول پیدا کردیا۔

1947ء کے بعد جموں کشمیر میں اردوصحافت کا سفر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شروع ہوا اوراس وقت تک سینکڑوں روز نامے ہفت روزے اور ماہنامے یہاں اردوصحافت کوفروغ دے رہے ہیں۔کشمیر کے جن صحافیوں نے 65-1960ء سے اردوصحافت کے معیار کو قائم کرکے اپنی بیش بہا خدمات انجام دیں اُن میں مولوی محمد سعید مسعودی،غلام محمد کشفی،مفتی جلال الدّین ،مولوی غلام نبی مبارکی،مولوی قاسم شاہ بخاری،غلام محی الدّین رہبر،عاشق کاشمیری،میر عبدالعزیز، نندلال واتل،غلام رسول عارف،شمیم احمد شمیم،خواجہ ثناءاللہ بٹ،صوفی غلام محمد،غلام نبی خیال،کرشن دیوسیٹھی،کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر،فیاض احمد کلو،یوسف جمیل اور طاہر محی الدّین جیسے ممتاز صحافیوں کی اردوصحافتی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردوصحافت کے عصری منظر نامہ کے حوالے سے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہاں ایک سو کے قریب روز ناموں اورہفت روزوں کی اشاعت اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ 1980ء کے بعد بتدریج روز ناموں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ہے۔جموں کے مقابلے میں کشمیر میں اخبارات کی تعداد درجنوں میں ہے جن میں کچھ اہم اخبارات کے نام یہاں درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جیسے ''کشمیر عظمیٰ،تعمیل ارشاد،آفتاب،روشنی،سرینگر جنگ،گھڑیال،وِیتھ،سری نگر نیوز،سری نگر ٹائمز،آفاق،عقاب، سٹی رپورٹر،ایشین میل،ایشین ایکسپریس،سرنگر میل،شہنشاہ ہفت روزہ سری نگر سماچار،ہفت روزہ شہر بین، ہفت روزہ ندائے کشمیر،روزنامہ اخبار مشرق،روزنامہ چٹان،روزنامہ وادی کی آواز،بلند کشمیر،سری نگر ریز۔جموں سے شائع ہونے والے روزناموں میں''لازوال،اُڑان، چٹان،عوامی لہر،تسکین،اذان سحراور

آسمان باذوق قارئین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔لیکن اس سب کے باوجود اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلے کے مقابلے میں مجموعی طور پر اخبارات کی ریڈرشپ میں بہت کمی آگئی ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ انٹرنیٹ کی آمد ہے۔اب لوگ اخبار کم ہی خریدتے ہیں کیونکہ اُنھیں انٹرنیٹ پہ اخبار بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔یہاں میں اس حقیقت کو بیان کئے بغیر آگے بڑھنا نہیں چاہتا کہ جس طرح ٹیلی ویژن نے ہم سے بہت حد تک ریڈیو چھین لیا ہے۔کمپیوٹر نے ہم سے فن خوش نویسی،موبائل فون نے ہم سے مکتوب نگاری۔اسی طرح انٹرنیٹ نے ہم سے کتاب اور اخبار چھیننا شروع کر دیا ہے۔مانا کہ اکیسویں صدی میں ذرائع ابلاغ ہماری زندگیوں کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے مگر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہ سب ایک طرح کا ہوائی سلسلہ ہے۔

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح جموں وکشمیر میں بھی اردو اخبارات کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ہیں پیسہ،طباعت،نیوز پرنٹ،اشتہارات اور سرکولیشن۔علاوہ ازیں اردو روزنامے نئی صحافت کے بدلتے رجحانات سے کوسوں دُور رہے ہیں جب کہ اخبارات کے مدیران کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ وہ وقت کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو جملہ معلومات مہیا کرائیں جن سے اُنھیں آسانی فراہم ہو سکے کیونکہ اخبارات قارئین کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں۔بلاشبہ اخبارات حیات اور حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبارات کے مالکان صحافت کو ایک مقدس پیشہ خیال کریں۔زیادہ تر وہی اخبارات زندہ رہتے ہیں جن کا تعلق زیادہ تر بڑے تجارتی اداروں اور مضبوط تجارتی خاندانوں سے ہوتا ہے۔روزنامہ ''کشمیر اعظمیٰ'' میں ایک طویل مدت تک کام کرنے والے کشمیر کے ایک بے باک،ذہین اور تجربہ کار صحافی ش۔م۔احمد نے ''جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا سفر'' کے عنوان سے ایک جامع اور پُر اثر مضمون قلم بند کیا ہے جس میں وہ ماضی میں اردو صحافت سے مطمئن اور حال سے مایوس نظر آتے ہیں۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

> ''بہر کیف اردو صحافت کا سفر ماضی میں بہت ہی شاندار رہا ہے مگر حال کے بارے میں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ روبہ زوال ہے۔اس کے قارئین کا حلقہ بلاشبہ خاصا وسیع وعریض ہے مگر سنجیدہ اور تازہ دم اردو قلم کاروں کا واقعتاً کال پڑا ہوا ہے۔اس کی ایک وجہ اردو زبان کی شکستہ حالی اور سرکاری سطح پر اس زبان سے لاتعلقی بھی ہے اور سرد مہری بھی۔اردو صحافت کا بوجھل قدموں کا سفر اردو زبان کی حالت زار کی صدائے بازگشت ہے۔ہمارے آج کے وہ اردو کالم نگار جنھیں نہ صرف عمدہ لکھنے پر دسترس اور علم پروری کا ملکہ حاصل ہے

ISSN : 2582 - 3612

> بلکہ جو اپنی تحریروں سے باذوق قارئین کی ذہنی تشفی کا سامان بھی کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں،اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے''

مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا مستقبل کسی حد تک تشویشناک ہے۔اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں کی حکومتوں نے اُردو زبان کو اُس کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اردو صحافت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا ہے۔تیسری وجہ یہ ہے کہ ماضی کے مقابلے میں یہاں اردو صحافت کو وہ ذہین اور باذوق قلمکار اور قارئین میسر نہیں ہیں۔میں آخر میں یہ سجھاؤ دینا چاہتا ہوں کہ جموں کشمیر میں اردو صحافت کا مستقبل اُسی صورت میں تابناک ہو سکتا ہے کہ جب اردو زبان کو سرکاری طور پر تحفظ اور اُس کا صحیح مقام ملے۔علاوہ ازیں کوئی بھی زبان اُسی صورت میں زندہ رہتی اور ترقی کی منازل طے کرتی ہے جب وہ ٹکنالوجی کے ساتھ چلے لہٰذا اردو صحافت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

Dr. Mushtaq Ahmed Wani
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajouri
(Jammu & Kashmir)
Mob.- 78899 52532

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد رئیس

مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری

یہ حقیقت ہے کہ مجتبیٰ حسین نے ادبی دنیا میں اپنی تخلیقات کے سبب کافی شہرت پائی ہے اور یہ شہرت عالمی سطح پر حاصل ہوئی ہے۔ یہ کافی قابل ستائش کا پہلو ہے کہ انہوں نے جس صنف میں طبع آزمائی کی اسے لافانی مقام عطا کر دیا اور خود کا نام بھی روشن کیا۔ ان کی تحریریں ادبی حلقے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم اس بات سے آشنا ہیں کہ انیسویں صدی سے سفرنامہ ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کر چکا ہے کیوں کہ بہت سارے قلم کاروں نے سفرنامے لکھے ہیں انہی میں ایک اہم نام مجتبیٰ حسین کا بھی ہے۔ آپ نے اپنے سفرنامے کے ذریعہ قارئین ادب کو ایسی دنیا کی سیر کرائی ہے جس کا انہوں نے کھلی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ مجتبیٰ حسین کے سارے سفرنامے کافی کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ کے سفرنامے اضافے کی حیثیت اس لئے بھی رکھتے ہیں کہ اس میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی موجود نظر آتی ہے۔ کیوں کہ مجتبیٰ حسین اس بات سے آشنا تھے کہ طنز و مزاح کا رنگ سفرنامے کے میدان کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دے گا اسی لئے انہوں نے اپنی کاوش سے اس بات کا انکشاف کر دیا کہ طنز و مزاح کسی بھی موقع پر بے اثر نہیں ہوتا اسی لئے آپ کے سفرنامے میں طنز و مزاح کا رنگ جلوہ نما نظر آتا ہے۔

ہلکے جملے، محاوروں کا برجستہ استعمال اور کہیں لفظ کہیں معنی سے پیدا ہوتا مزاح آپ کے سفرنامے کو لاجواب بنا دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کا دوسرا میدان آپ کے سفرنامے ہیں۔ مجتبیٰ حسین ملک اور بیرون ملک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ آپ کے سفرنامے مختصر ہیں، لیکن اپنی دلکشی، تجسس آفرینی اور قدر و قیمت میں دیگر سفرناموں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ آپ کا سفرنامہ جاپان چلو جاپان کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مجتبیٰ حسین جاپان کی ایک دلکش تصویر پیش کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامے کا ہندی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا اور جاپانی زبان میں بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جاپانیوں کو بھی یہ سفرنامہ کافی پسند آیا ہوگا۔ انہیں اپنی معاشی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کی سچی تصویر اس سفرنامے میں دیکھنے کو ملی ہوگی۔ آپ کی سفرنامہ نگاری کے حوالے سے حسن چشتی فرماتے ہیں :

''آج کے زمانے میں دنیا کا کوئی نیا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکتا ہے، لیکن

ISSN : 2582 - 3612

مجتبیٰ کی سیاحتوں کی کچھ خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ اپنے سفر کا بیان اپنے دلچسپ انداز میں کرتا ہے کہ وہ نیا تجربہ معلوم ہونے لگتا ہے دوسرے وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں اردو زبان کو تلاش کرتا ہے یا حیدرآبادی تہذیب اسے تلاش کر لیتی ہے وہ نئی شخصیات سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔ خود ان سے بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے تو وہ شخصیات ہمیں بھی مانوس معلوم ہونے لگتی ہیں۔''

(کتاب نما نمبر) مجتبیٰ حسین فن اور شخصیت، جولائی ۲۰۰۴ء، ص-۱۲۳)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ آپ کے سفرنامے ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے سفرناموں کے ذریعہ مجتبیٰ حسین نے ہم قارئین کو سفر کے اہم تجربات دلچسپ معلومات، سنجیدہ مسائل وغیرہ سے بالکل منفرد انداز میں آشنا کراتے ہیں۔ جس میں ان کے تجربات و مشاہدات کارفرما نظر آتے ہیں۔ آپ طنز معکوس کا سہارا لے کر خود کو ہی طنز کا ہدف بنانے کا خوب ہنر جانتے ہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ ہنسی ہنسی میں دوسروں کی عظمت کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں اور سماجی عیوب کو سامنے بھی لے آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے جاپان کا سفر (۱۹۸۰ء) کے اواخر میں کیا اور اس سفر پر انہوں نے سفرنامہ لکھا جو رسالہ ''سیاست'' میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ تمام قسط کتابی شکل میں (۱۹۸۳ء) میں منظر عام پر آئے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جاپان کا سفر مجتبیٰ حسین کے لئے وسیلہ ظفر ثابت ہوا اس کے بعد ہی انہوں نے برطانیہ فرانس، امریکہ، کناڈا، روس، سعودی عرب، دبئی اور پاکستان کے ممالک کا بھی سفر کیا اور لندن، پیرس، شکاگو، تاشقند کے سفر کے احوال کو کتاب ''سفرلخت'' میں جمع کر دیا۔

ہم اس بات سے آشنا ہیں کہ اردو میں سفرناموں کی روایت پرانی ہے۔ سرسید کا مسافران لندن، شبلی نعمانی کا سفرنامہ مصر و روم و شام، قاضی عبدالغفار کا نقش فرنگ، بیگم حسرت موہانی کا سفرنامہ عراق اور سید سلیمان ندوی کا سیر افغانستان کو ادبی حلقے میں کافی پسند کیا گیا۔ اسی طرح احتشام حسین کا سفرنامہ ساحل اور سمندر بھی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالیہ کے سفرناموں میں گوپی چند نارنگ، رام لعل، جگن ناتھ آزاد اور مجتبیٰ حسین کے تحریر کردہ سفرنامے ادبی حلقے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے اس لئے انفرادیت کا حامل ہیں کہ ان میں مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے اس سلسلے سے ان کے تحریر کردہ سفرنامے اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے:

''مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ جاپان ایک بالکل ہی نئے اور منفرد ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ ہر ادیب اپنے اپنے طور پر سفر کی روداد بیان کرتا ہے اس میں کہیں مشاہدات اور محسوسات کا بیانیہ ہوتا ہے کہیں تاریخی واقعات ہوتے ہیں جغرافیائی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

معلومات۔مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی یہ سب ہے،لیکن انہیں تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ انسانوں کے عادات واطواران کے مزاج وخصائل ان کی رفتار وگفتار سے دلچسپی ہے زندگی کی بابت ان کے رویوں سے دلچسپی ہے۔.......... جاپان میں مجتبیٰ حسین نے ایک ماہ سے کچھ زیادہ قیام کیا اور اس دوران انہوں نے اس سرزمین کو اس کی تہذیب وثقافت کو وہاں کی شخصیتوں کو اچھی طرح اپنے آپ میں جذب کیا اور اپنی فطری شوخی سے ان میں ایسا رنگ بھرا کہ ان کا سفرنامہ اپنی لطافت اور نفاست کے اعتبار سے ایک یادگار حیثیت اختیار کر گیا۔''

(مجتبیٰ حسین فن اور شخصیت کتاب نما نمبر، جولائی ۲۰۰۴ء،ص-۵۳)

آپ کی سفرنامہ نگاری کو بہت خوب ہے اس کا اسلوب نگارش بھی قابل ستائش ہے۔

مجتبیٰ حسین کا اسلوب نگارش ان کا اپنا ہے۔وہ آسان اور دل میں اتر جانے والی ایسی زبان لکھتا ہے جس سے خود زبان کی وسعت وہمہ گیری اور قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں کہیں تکلف اور تصنع آورد یا آرایش اور زیبائش کا شائبہ نہیں ہوتا۔اس کا مشاہدہ وسیع بھی ہے اور گہرا بھی وہ ایک صوفی کی طرح اپنی تحریروں میں بے ہمہ بھی ہے باہمہ بھی۔وہ ہمیں اور آپ کو اپنے شخصی تجربات میں بھی ایسی سہولت سے شریک کرلیتا ہے کہ اس کے جذبات واحساسات ہمیں اپنے ہی محسوس ہوتے ہیں۔اسی کو بلاغت کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہا گیا ہے کہ دیکھنے میں بہت سہل اور سبک معلوم ہو لکھنے بیٹھیں تو بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیں۔نہ اس کے لفظوں کا خزانہ کم ہوتا ہے نہ ان کی تاثیر میں کمی آتی ہے۔نہ خیالات کی بیجا تکرار ہوتی ہے نہ ترسیل میں کوئی کمی رہتی ہے وہ معمولی سے موضوع کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو نہایت معمولی بنانے کا فن بھی جانتے ہیں دوسروں کے لئے یہ فن ایسا ہی ہے جیسے اگلے وقتوں کے لوگ کیمیا بنانے میں اپنی عمر میں اور سرمایہ داؤں پر لگادیتے تھے پھر بھی ایک آنچ کی کسر ہمیشہ رہ جاتی تھی۔

مجتبیٰ حسین کے سفرنامے اپنے اسلوب طریقہ اظہار اور زبان وبیان کی جمال آفرینی کے باعث ادب کے بلند درجے پر فائز ہیں۔آپ کے یہاں محاورہ اور تشبیہ کا خوبصورت امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔اس سلسلے سے یہ سطر دیکھئے :

''شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔لہٰذا ہر دکان کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی ہے۔''

(کتاب نما نمبر) مجتبیٰ حسین فن اور شخصیت، جولائی ۲۰۰۴ء،ص-۳۳)

آپ کا اسلوب تبسم آفریں ہے۔آپ روزمرہ زندگی کے مضحک زاویے تلاش کرتے ہیں اور

پڑھنے والوں کو مسرت عطا کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ آپ کے سفرنامے میں سبک مزاح اور لطیف طنز کی چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ کے سفرنامے میں سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔آپ کا سفرنامہ سفر لخت لخت کا مطالعہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ آپ کے سفرنامے شگفتہ نگاری کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔یہاں طنز ومزاح کا ارتکاز بھی دیکھنے کو ملتا ہے اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''ہمیں لندن کی ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ کو بنائی مگر دوسروں کا جغرافیہ بگاڑا۔''

(ایضاً،ص-۵۶)

یہ حقیقت ہے کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے اسالیب کے امتزاج اور ارتفاع سے مزاح کا جو معیار بنا ہے اس کا نقطہ عروج مجتبیٰ حسین کے یہاں موجود ہے۔آپ نے رشید احمد صدیقی اور پطرس کی روایت کو آگے بھی بڑھایا اور مشتاق احمد یوسفی کے ہم پلہ بننے میں بھی کامیاب ہوئے۔آپ کے یہاں انسانی محبت ہے اور دلنوازی بھی ہے۔آپ کی زبان دانی کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے:

''جاپانیوں کو اندھیرے سے سخت نفرت ہے لہٰذا اپنی سڑکوں اور گھروں کو اتنا روشن رکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی روشنی طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔''

(ایضاً،ص-۵۴)

مندرجہ ذیل تمام باتوں کی روشنی میں ہم مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔مختصر یہ کہ مجتبیٰ حسین نے سفرنامہ لکھا اور خوب سے خوب تر لکھا ہے ٹوکیوں میں یاد ابن انشاء کی، جاپان میں ہم لکھ پتی بن گئے، جاپان میں اسلام، ٹوکیو کے بازاروں میں، لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں، قیام الدین کے گھر ہمارا قیام، برطانیہ میں دھوم ہمارے زبان کی، مسقط کی صفائی اور قصہ اردو شاعر کا، کچھ حیدر آبادیوں کے بارے میں، لبیک اللھم لبیک، اور ہم حاجی بن گئے، ہم مدینہ سے بول رہے ہیں، دوبئ سے واپسی، کچھ باتیں دوبئ کی، امریکی بزرگوں کے درمیان، ذکر امریکہ کے اردو اخبارات کا، امریکی کانگریس کی عمارت میں نماز جمعہ، کچھ یادیں امریکہ کی ایسے سفرنامے ہیں جن سے آپ کی فنی حسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس بات کا اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ مجتبیٰ حسین اپنے آپ پر ہنسنے کا زبردست حوصلہ رکھتے ہیں۔

Dr. Md. Rayees
Head
Deptt. of Urdu
M. S. K. B. College
Muzaffarpur (Bihar)
Mob.- 94312 85544

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

محمد خالد عابدی: ایک ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت

زیرِ نظر مضمون کا عنوان بہت غور و فکر کے بعد قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ عابدی صاحب نے از اول تا ایں دم مختلف حوالوں سے یا مختلف تناظر میں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیں اس لئے انہیں بجا طور پر ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہو جسے اس سے انکار ہو کہ عابدی صاحب کی شخصیت ہمہ جہت اور عہد آفریں نہیں ہے۔ اگر بالفرض ایسا کوئی شخص نکل آیا تو راقم الحروف کی نظر میں وہ کور چشم اور سنگ دل ہی ہوگا۔

عابدی صاحب کی ادبی زندگی کا سفر شعر گوئی سے شروع ہوا۔ جب آپ خالدؔ بھوپالی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے تاہم ایک مقام پر خود فرماتے ہیں کہ :

> ''ادب میں میری ابتداء شاعری سے ہوئی تھی۔ میں شاہدؔ بھوپالی اور بعدہٗ عشرت قادری صاحب سے اصلاح لیتا تھا۔ خالدؔ بھوپالی تخلص کرتا تھا۔ میں اپنے اساتذہ سے معمولی باتیں بار بار پوچھتا رہتا تھا۔ کئی معاملے میں ہمارے ایک استاد نے کہا کہ تم بہت پوچھتے ہو اور وہ پوچھتے ہو جو ہم نے پڑھا نہیں یا ہم اس علم و فن کے بارے میں جانتے نہیں ہیں۔ میں موزوں طبع تھا، میرا وہ کلام جو 'ملاپ' 'پرتاپ' دہلی میں چھپتا تھا اسے میں نے بھی محفوظ نہیں رکھا۔ فن عروض سے مجھے دلچسپی تھی۔ اس فن کو نہ جاننے کا صدمہ آج بھی ہے۔''

اگر عابدی صاحب نے اپنے مطبوعہ کلام کو یکجا و محفوظ رکھا ہوتا تو ممکن ہے ایک مجموعہ یا انتخاب شائع ہو سکتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں شاعری کے مقابلے نثر سے زیادہ لگاؤ رہا۔ لیکن اُن کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے۔

شاعری کے مقابلے نثر میں عابدی صاحب نے زیادہ کام کیا ہے۔ عام روش سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے نثر میں اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اسی لئے عہدِ حاضر کے سخت گیر اور اعتدال پسند، دونوں قسم کے نقادوں نے اُن کے کارناموں کو بجا طور پر داد و تحسین سے نوازا ہے۔ عابدی صاحب کے نثری

ISSN : 2582 - 3612

کارناموں کے پیشِ نظر انہیں اردو ادب کا کولمبس قرار دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ وہ اس ذیل میں بقول اقبالؔ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　　بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم ن ے

بہ حیثیت افسانہ نگار عابدی صاحب کا مقام نہایت وقیع ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو انفرادیت سے مالا مال کرنے کی سعی کی ہے اور انہیں موضوعات پر افسانے تحریر کئے ہیں جو ان کے تصورات و تفکرات کے عین مطابق ہیں۔ ان افسانوں پر حقیقت پسندانہ تخیلات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں اُن کے افسانوی مجموعے ''زخموں کے دریچے'' (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس مجموعے کے مشمولات نہ تو غیر ضروری ہیں اور نہ ہی غیر معتدل۔ اس کے علاوہ افسانچہ نگاری کا رجحان عام ہونے پر انہوں نے افسانچہ نویسی کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا کر دم لیا۔ ان افسانوں میں صنفِ غزل جیسا ایجاز و اختصار، اثر پذیری اور وسعت موجود ہے کیونکہ عابدی صاحب نے غزل کے شاعر کی طرح ان میں روح پھونک دی ہے اس لئے یہ افسانچے بہت جلدی قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''نقطۂ نوگریز'' (مطبوعہ ۲۰۰۹ء) اردو افسانچہ نگاری کی تاریخ میں بیش بہا اور گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ محترم نعیم کوثر نے تحریر فرمایا ہے کہ :

> ''خالدؔ عابدی کے افسانچے خاص طور پر موضوعِ بحث بننے لائق ہیں۔ ''نقطۂ نوگریز'' کی منی کہانیاں نہ صرف ادبی نزاکتوں کی سوجھ بوجھ کی عکاس ہیں بلکہ تاثرات کی گہرائیوں میں غرق کر دیتی ہیں اور قاری پر ایک لطیف سی کیفیت طاری کرتی ہیں۔ رفعت خیال اور حسن بیان مختصر ترین کہانیوں میں سمو دینا اعلیٰ تخلیقانہ فن کاری اور مشاہدات کی گہرائی کا بین ثبوت ہے۔ راقم الحروف کو خالد عابدی کی منی کہانیوں میں لفظی مصوری کا ادراک ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا موقع کی صحیح تصویر غیر مرئی رنگوں میں اُبھر آتی ہے۔''

عابدی صاحب کو ڈرامہ نگاری سے بھی گہری دلچسپی ہے، انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ریڈیو پروگرامز کی ضرورت کے مطابق ریڈیائی ڈرامے لکھے جو آل انڈیا ریڈیو کے پروگرامز میں نشر ہو کر سامعین کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''آواز نما'' (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اسی طرح نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے پیشِ نظر بھی انہوں نے ڈرامے تخلیق کیے جن کا مجموعہ ''ٹیچر کے بغیر'' (مطبوعہ ۱۹۹۴ء) شہرت کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے مشہور ڈرامہ نگار نیز ناقد ڈرامہ نگاری مرحوم ابراہیم یوسف کا یہ بیان وثوق سے خالی نہیں ہے کہ :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''............''آواز نماز'' کے بارے میں یہ چند سطور لکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اردو میں ڈراموں اور ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے کم ہیں۔ اس لحاظ سے آواز نما اردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ان ڈراموں کو پڑھ کر ضرور کہیں گے کہ ''خالد صاحب آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی'' اور یقیناً یہ خوشی نہ تو تکلفاً ہوگی اور نہ رسماً بلکہ حقیقی ہوگی۔''

ریڈیو سے وابستہ اکثر اردو ادیبوں اور شاعروں کی طنز و مزاح سے دلچسپی رہی ہے۔ پطرس بخاری کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مضامین پطرس اسی دلچسپی کا ثمرہ ہیں۔ عابدی صاحب نے نہ صرف پطرس کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اُس میں اضافہ بھی کیا۔ ان کے کئی مضامین جو طنز و مزاح سے متعلق ہیں، معاصر رسائل و جرائد اور انتخابات میں شائع ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوئے۔ ان مضامین میں خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور رپورتاژ نگاری کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُن کی اس قسم کی تحریروں کا ایک مجموعہ بعنوان ''شکایتاً عرض ہے'' ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آ کر اپنا اثر دکھا چکا ہے۔ اس مجموعے کے مشمولات کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کے طنز و مزاح میں بلا کا اعتدال موجود ہے۔ اُن کے یہاں چھینٹیں اڑا دینے والی ہنگامہ آرائی ہے اور نہ ہی بعض نام نہاد طنز و مزاح نگاروں جیسی سست اور سرد کیفیت۔ ایسے اہل قلم کی تحریروں کو نہ جانے کیوں طنز و مزاح کے زمرے میں شامل کر کے غلط روایت قائم کی جاتی رہی ہے۔ خیر عابدی صاحب اس طرح کی کمزوریوں سے ہمیشہ محفوظ رہے ہیں۔ اُن کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں ادبِ لطیف کے عمدہ نمونے موجود ہیں جو اپنا مخصوص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید بظاہر خشک موضوعات سمجھے جاتے ہیں۔ باذوق حضرات اس میدان میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن عابدی صاحب ایسے باذوق شخص ہیں جنہوں نے اپنے پُر اثر اسلوب کے سبب ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید میں بھی اثر پذیری پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے ''باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نسّاخ'' (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) کی ترتیب و تدوین کا کارنامہ بحسن و خوبی انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ علم و فن مخصوص لوگوں کی جاگیر نہیں ہے۔ اگر کوئی بھی شخص محنتِ شاقہ اٹھا کر اس قسم کا کام کرے تو اس کام کی حیثیت مسلّم ہوگی۔ مرحومہ شفیقہ فرحت صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے کہ :

''میں نے خالد صاحب کی کتاب ''نسّاخ'' کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید خالد صاحب کے علاوہ کسی نے اتنی محنت کی ہو پھر مجھے اس سے بات چیت کرتے ہوئے معلوم نہ ہوا کہ وہ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں مجنوں سے بھی زیادہ دیوانہ ہے (مجنوں گورکھپوری

کی روح سے معذرت کے ساتھ) کاغذ کے ایک ایک پرزے کو چوم چوم کر آنکھوں سے لگا کر رکھتا ہے۔''

ترتیب و تدوین سے قطع نظر عابدی صاحب کے تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات بھی اہلِ علم و ادب کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ہند و پاک کے مؤقر رسائل و جرائد میں اُن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات تزک و احتشام کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں جن کا ایک مجموعہ بعنوان ''مضامینِ خالد'' ۱۹۹۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں ان کی بعض نمائندہ مضامین کو شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہنوز اُن کے متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات معاصر رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ امید ہے کہ عابدی صاحب اُن گوہر ہائے آبدار کو بھی یکجا کر کے جلد ہی ایک لڑی میں پروئیں گے تاکہ علم و ادب کے بعض تاریک گوشے روشن ہو سکیں۔

انٹرویو بہت مشکل فن ہے اور اس کا مشکل کا سامنا انٹرویو لینے والے اور دینے والے دونوں کو کرنا پڑتا ہے۔ عابدی صاحب نے ہمیشہ چیلنجز کو قبول کیا ہے، اس کا بیّن ثبوت اس طرح فراہم ہوتا ہے کہ آپ نے بے شمار علمی و ادبی شخصیات اور قلمی ہستیوں کے کثرت سے انٹرویوز لیے ہیں۔ عابدی صاحب کبھی انٹرویو دینے والی شخصیت پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتے، وہ بڑے مہذب و مؤدب طریقے سے انٹرویو لیتے ہیں اور ہمیشہ اس قسم کے سوالات پوچھتے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے کارآمد اور معلوماتی ہوتے ہیں نیز ان کا پہلو رجائی اور مثبت بھی ہوتا ہے۔ اگر عابدی صاحب کے ان معلومات افزا انٹرویو سے متعلق تفصیلات حاصل کرنی ہوں تو اُن کے انٹرویوز اور ملاقاتوں کے مجموعوں ''اردو انٹرویوز'' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) اور ''اردو مراسلاتی انٹرویو'' کا مطالعہ ناگزیر ہے جن میں عابدی کے وہ انٹرویو شامل ہیں جو انہوں نے اردو ادیبوں، شاعروں اور ہندوستان فلمی کی ہستیوں سے وقتاً فوقتاً لیے۔

فلم عابدی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس امر کی غمازی کی ہے کہ اردو کی ہندوستانی فلم کو مقبولیت دلانے میں کلیدی حیثیت رہی ہے۔ وہ اس موضوع پر بقولِ خود ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کے استادِ محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس موضوع کو پسند نہیں فرمایا۔ عابدی صاحب نے اردو اور فلم کے موضوع پر اگرچہ ڈاکٹریٹ نہ کی ہو لیکن ''ہماری فلمیں اور اردو'' کے زیرِ عنوان ۲۰۰۹ء میں ایک تحقیقی کتاب مرتب کی جس میں گیارہ مشاہیر کی ہندوستانی فلموں سے وابستگی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے خوب پذیرائی کی ہے۔ اس کا اندازہ ان تبصروں، مضامین اور تاثراتی خطوط سے ہوتا ہے جو اس کتاب کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ محمد ایوب واقف (ممبئی) لکھتے ہیں کہ ''ہماری فلمیں اور اردو'' میں کچھ ایسے عنوانات پر

آپ نے خامہ فرسائی کی ہے جو اس وقت بھی نئے تھے جب آپ کے قلم کی جنبشوں سے یہ وجود میں آئے اور آج بھی اتنے ہی تازہ اور نئے ہیں۔ان عنوانات پر ابھی تک بہت کم لوگوں نے لکھا ہے۔

اسی سلسلے میں جناب رؤف خیر (حیدر آباد) نے تحریر فرمایا ہے کہ :

''ہماری فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ پردے کی زینت ہو کر سامنے آتا ہے۔مگر بہت ساری باتیں ''پسِ پردہ'' ہوتی ہیں جن کی آپ نے نشاندہی کی ہے۔آپ نے دلچسپ پیرائے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔''

اردو خطوط نگاری کے سلسلے میں عابدی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جب آپ کے استاد محترم نے فلموں سے متعلق موضوع کو مسترد کیا تو انہیں ''بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب'' موضوع برائے پی ایچ۔ڈی تفویض کیا جس پر عابدی صاحب نے خوب محنت کی اور مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا لیکن افسوس کہ اُن کا تمام تحقیقی اثاثہ ایک حادثے کی نذر ہو گیا اور انہیں ڈگری نہیں مل سکی۔اس کا قلق یا افسوس عابدی صاحب کے علاوہ ان کے اہلِ خانہ اور دوست احباب کو بھی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ عابدی صاحب کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کرنا چاہئے کیونکہ ان کا مجموعی کام اسی کے لائق ہے۔افسوس کہ ماضی قریب میں بعض ایسے لوگوں کو ہندوستان کے باہر کی یونیورسٹیز نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے جو محض پانچویں جماعت پاس جاہل ہیں اور رات کو گیارہ بجے کے بعد اہل علم و ادب کو موبائل فون کر کے مجبور کرتے ہیں کہ پانچ ہزار روپیہ دیجئے، ہم اپنے رسالے میں آپ کا گوشہ نکالنا چاہتے ہیں۔ایسے مدیران کے رسائل بھی غیر معیاری ہیں اور محض ادبی بلیک میلنگ پر چل رہے ہیں۔اس قسم کے بعض جاہلوں کے خطوط میرے پاس کثرت سے موجود ہیں۔وہ یونیورسٹی اور کالج کے پروفیسرز کو لالچ دے کر مجبور کرتے ہیں کہ ہم پر آپ پی ایچ۔ڈی کرائیں، ہم آپ کا گوشہ نکالیں گے یا آپ پر کتابیں لکھوا کر شائع کرا دیں گے۔اس تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ عابدی صاحب اس قسم کے کم ظرف اور نااہلوں سے ہزار درجہ بہتر شخص ہیں۔جو اتنی ڈھیر سی کتابوں کے مصنف ہو کر بھی بڑی سادگی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔اس لئے نہ صرف انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی جانی چاہئے بلکہ اُن پر بھی تحقیقی کام ہونا چاہئے۔

Dr. Moinuddin Shaheen
Associate Professor
Deptt. of Urdu
S.P.C. Govt. College
Ajmer (Rajasthan)
Mob.- 78509 21002

ڈاکٹر محمد صادق حسین

ترقی پسند اردو ناول

اردو ناول چوں کہ ابتداء ہی سے زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان رہا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے بعد اردو ناول زندگی اور اس کے مسائل کے نئے تقاضوں سے ہمکنار ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ نئے علوم نظریات و تصورات اور عصری شعور نے ناول نگاروں کے ذہن کو بالیدگی اور تنوع عطا کیا۔ جس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ حقیقت نگاری کے روایتی انداز میں تبدیلی آئی۔اب جو ناول تحریر کئے گئے ان میں ناول نگاروں کا سیاسی، سماجی، معاشی اور تاریخی شعور کھل کر سامنے آنے لگا۔مختصر یہ کہ رومانیت اور مثالیت پسندی کی جگہ عقلیت پسندی اور راست گوئی کو خصوصی جگہ حاصل ہو گئی۔مطلب یہ کہ پریم چند نے اردو ناول کو جس مقام تک لایا تھا ترقی پسند ناول نگاروں نے وہاں سے اپنا ادبی سفر طے کیا۔زندگی اور سماج کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا جسے ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنا موضوع نہیں بنایا۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''غلامی کا کرب آزادی خواہی اور اس کے لئے جدوجہد کی آرزو طبقاتی کشمکش جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی درندگی اور غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال، غربت، افلاس، بیکاری، سماجی و معاشی انتشار اور اس سے پیدا شدہ بے چینی، بے اطمینانی اور محرومی، جنسی گھٹن، محبت پر پابندی، متوسط اور اعلیٰ طبقے کی اخلاقی اقدار اور معاشرتی زندگی کا انحطاط مذہبی جبر و استحصال نفسیاتی اور داخلی کشمکش سماجی بدعنوانیاں قدروں کی شکست و ریخت قومی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی انسان دوستی دردمندی اور ایثار و قربانی وغیرہ بے شمار متنوع اور نو بہ نو موضوعات سے ناول کے دامن کو وسعت عطا کرنے کی کوشش کی۔''

(ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا ص-۷۲-۷۳)

لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ترقی پسند ناول نگاروں نے خارجی اور داخلی حقائق کی پیشکش سے اردو ناول کے دامن کو وسیع کیا۔صرف موضوعاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ تکنیکی سطح پر بھی نت نئے تجربات سے اردو ناول کو ہمکنار کیا۔اس لحاظ سے سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی کے نام زیادہ قابل تحسین ہیں۔

سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات جدید اردو ناول نگاری کے نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں سجاد ظہیر نے اپنے عہد کے نوجوانوں اور طالب علموں کے ذہنی انتشار اور داخلی کرب کے حوالے سے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی و اخلاقی تمام حالات سے قارئین ادب کو روبرو کرانے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے سے سید وقار عظیم رقم طراز ہیں :

''اس مختصر سے ناول میں کرداروں کے عمل اور ان کے جذباتی ہیجان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے۔زندگی کے پس منظر میں ہر وقت اس کے انتشار کا احساس ہے۔سیاست اور زندگی میں جو گہرا ربط ہو گیا ہے اس کا پرتو ہے حسن اور اس کے مسائل کو ایک علمی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔فلسفہ اخلاق پرانے رسوم و قیود کا نہیں بلکہ فطرت کا پابند ہے۔اس ناول کا انداز سر تا سر فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس سے باہر یوروپ کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔کہیں کہیں اس میں سیاسی اور معاشی نقطہ نظر کی جھلک بھی ہے۔''

(داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ص-۵۷)

ناول کے تمام کردار فکر و احساس کی سطح پر اپنی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ذہنی سطح پر بھی سبھی کردار اپنی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں تک تکنیک کی بات ہے تو سجاد ظہیر نے پہلی بار شعور کی رو کی تکنیک کو اپنا کر اپنی فنی گرفت کا ثبوت دیا ہے۔اس اعتبار سے بھی یہ ناول بیش بہا کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترقی پسند ناول نگاروں کی صف میں ایک اہم نام کرشن چندر کا بھی ہے۔آپ نے کئی ناول لکھے جن میں شکست، جب کھیت جاگے، غدار، طوفان کی کلیاں، دل کی وادیاں سو گئیں، ایک گدھے کی سرگزشت، ایک عورت ہزار دیوانے، لندن کے سات رنگ اور ایک وائلن سمندر کے کنارے ہیں۔ان تمام ناولوں کے مطالعے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے زندگی کے متعدد مسائل کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان تمام ناولوں میں ناول شکست ترقی پسند ناولوں کی صف میں اپنی اہمیت کو درج کرانے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ اس ناول میں کرشن چندر نے پہلی بار حقیقت اور رومان کے امتزاج سے صحت مند جذباتی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے سے سید وقار عظیم فرماتے ہیں :

''لندن کی ایک رات کے بعد سات برس تک کوئی ایسا ناول نہیں لکھا گیا جسے

ISSN : 2582 - 3612

فنی حیثیت سے کوئی امتیازی جگہ دی جا سکے۔۱۹۴۲ء میں کرشن چندر کا شکست شائع ہوا اور اس کے متعلق پڑھنے والوں میں متضاد رائیں پھیلی بہت اچھی بھی بہترین بھی،لیکن وہ ایک ایسی چھوٹی سی دنیا ہے جو ہمیں تھوڑی دیر کے لئے صرف اپنا بنا لیتی ہے اور ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔''

(داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ص-۱۵۸)

اس ناول کے حوالے سے سید وقار عظیم مزید فرماتے ہیں کہ :

شکست نئے دور کے انتشار میں ایک نئی اور دلکش دنیا کی تلاش و جستجو کا ترجمان ہے۔''

(داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ص-۸۸)

مختصر یہ کہ ناول شکست میں کرشن چندر نے ہندوستانی زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو پیش کیا ہے اس کے بعد رومانیت بھی ظاہر کی ہے۔جس باعث آپ کا یہ ناول اپنے مزاج و منہاج اور معنویت کے اعتبار سے سبقت لے جاتا ہے۔ساتھ ہی ہم اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ کرشن چندر کا یہ ناول دلکش اسلوب اور فطری منظر کشی کے لحاظ سے بھی منفرد شناخت رکھتا ہے۔

عزیز احمد کا شمار بھی ترقی پسند ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ نے بھی کئی ناول ہوس، مرمر اور خون، گریز آگ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں ایسی بلندی ایسی پستی اور شبنم تحریر کیا،لیکن یہ حقیقت ہے کہ عزیز احمد کو ادبی حلقے میں بحیثیت ناول نگار مقام دلانے میں ان کا ناول گریز نے اہم رول ادا کیا ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں اس ناول کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔عزیز احمد نے اس ناول کے ذریعہ فنی شعور عصری آگہی اور نفسیاتی و جنسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ساتھ ہی ماحول کے پس منظر میں انسانی فطرت اور اس کی نفسیاتی و جنسی جبلت کو فنکاری سے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

اس ناول میں اس عہد کا سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی نظام و اقدار اور ان کا تصادم شکست و ریخت اور ان سے پیدا شدہ ذہنی انتشار یاسیت بے اطمینانی محرومی تشنگی کرب تذبذب اور نظریاتی کشمکش غرض کہ سبھی کچھ جلوہ گر ہے۔''

(ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا، ص-۱۰۴)

اس ناول کا اختصاص اس پہلو میں بھی ہے کہ عزیز احمد نے ایک کردار کو نمائندہ بنا کر اس کے سارے خد و خال سے قارئین ادب کو روبرو کرایا ہے۔ناول گریز پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے درمیانی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

وقفے کے پرشورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ساتھ ہی عزیز احمد نے اس ناول کے ذریعہ اس عہد کی سیاسی اور معاشی فضا کا ایک منتشر خاکہ بھی ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔اس ناول میں عالمگیر مسائل کی پیشکش کرکے عزیز احمد نے اپنے تجربے کا احساس کرایا ہے۔صرف موضوعاتی اعتبار سے ہی نہیں تکنیکی سطح پر بھی یہ ایک کارآمد ناول تسلیم کیا گیا ہے۔مختصر یہ کہ عزیز احمد نے تحت الشعور داخلی خود کلامی اور فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل کی تکنیک کا استعمال کرکے اس ناول کو منفرد شناخت عطا کی ہے۔

ترقی پسند عہد میں لکھے گئے ناولوں میں عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔جس میں عصمت نے اپنے عمیق مشاہدات تجربات کی بنیاد پر متوسط طبقے کی زندگی کی معاشرتی صورتحال اور نفسیاتی گرہوں کی پیشکش میں فنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔یوں تو یہ ناول متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی لڑکی شمن کے کردار کے گرد گردش کرتا ہے۔مطلب یہ کہ شمن کی پیدائش سے لے کر اس کی شادی تک کے سارے واقعات بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اور اس پیشکش میں عصمت نے خاندانی سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی عوامل کی کارفرمائی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ناول ٹیڑھی لکیر سوانحی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اور عصمت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شمن کے کردار کی تشکیل و تعمیر میں حقیقت پسندی کا دامن تھامے رکھا ہے۔یہ بھی کہا جائے گا کہ عصمت بڑے ہی فنکاری کے ساتھ شمن کے حوالے سے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور معاشرت کے اقدار و رسومات اور ان سے پیدا شدہ خرابیوں پر گہری نظر رکھتی ہیں۔اس سلسلے سے کشن پرشاد کول فرماتے ہیں :

> ''انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو باہر کی کتابوں سے نہیں پڑھا ہے بلکہ اپنے گھر اور سوسائٹی میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ نفس کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے۔غور و فکر سے اسے جزو دماغ بنالیا ہے۔ جو کچھ سمجھتی ہیں اس پر انہیں یقین ہے اور جو کچھ یقین کرتی ہیں اس کو بے ساختہ کہہ دیتی ہیں۔تکلف نہیں وہ بصیرت کی نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں اور اس ترجمانی کا انہیں کمال کا سلیقہ ہے۔ہماری گھریلو زندگی کی جہاں جہاں انہوں نے تصویریں کھینچی ہیں پڑھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ نقاش Model سامنے رکھے ہوئے چربہ اتار رہا ہے۔''
>
> (نیا ادب، کشن پرشاد کول، ص-۱۵۳)

مختصر یہ کہ عصمت چغتائی نے ناول ٹیڑھی لکیر کے ذریعہ متوسط طبقے کی لڑکیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی پیشکش کے حوالے سے نئی اور پرانی قدروں کے درمیانی تصادم کو بھی فنکاری کے ساتھ سامنے

لایا ہے۔اس کے علاوہ قارئین کو اس پہلو سے بھی روشناس کرایا ہے کہ انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں ماحول اور سماجی و معاشرتی اقدار و حالات کا اہم رول ہوا کرتا ہے۔اس سلسلے سے سید وقار عظیم فرماتے ہیں :

> ''ہماری زندگی میں سیاست اقتصادیت فکر اور تخیل جس طرح گلے ملے ہیں عصمت کی نظر ان سب پر ہے..........عصمت کا یہ ناول پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر اور عزیز احمد کی طرح آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور نت نئی راہیں اختیار کرتے ہوئے فن کا ہم عنان ہے۔یہاں صرف اسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا گیا ہے جس کے رگ و پے میں لکھنے والے کا ذہن اپنی جگہ بنا چکا ہے۔اس زندگی کو غور و فکر نے نئے فن کے سانچے میں ڈھالا ہے۔''
>
> (داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص-۱۵۹)

اس طرح ناول ٹیڑھی لکیر کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لیا جاسکتا ہے۔ترقی پسند ناول نگاروں کے تعلق سے یہ بھی کہا جائے گا کہ ان تمام نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقے کو مرکزیت عطا کی ہے۔ ساتھ میں اردو ناول کو نئے تجربات و رنگ و آہنگ سے ہمکنار کیا ہے۔آخر میں اس سلسلے سے میں یہ اقتباس شامل کرنا چاہوں گا۔ملاحظہ کیجئے :

> ''چوں کہ اس عہد کے ناول نگاروں نے خارجی عوامل اور محرکات کے پس منظر میں داخلی اور نفسیاتی زندگی کی تصویر کشی پر زیادہ زور دیا ہے۔لہٰذا اکثر ناولوں میں آپ بیتی کا انداز ملتا ہے۔ان میں روایتی ناولوں کی طرح پلاٹ یا کہانی کو مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔بلکہ کرداروں کی جذباتی اور نفسیاتی حالات و کیفیات کو پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔گویا ان میں کرداروں کی پیشکش کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے بھی اس دور کے ناول کافی اہمیت رکھتے ہیں ان میں روایتی اور سپاٹ اسلوب کی جگہ رنگا رنگ اور متنوع اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔''
>
> (ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا، ص-۱۳۴)

Dr. Md. Sadique Hussain
Head
University Deptt. of Urdu
Purnia University
Purnia (Bihar)
Mob.- 70919 33476

ڈاکٹر ارشد اقبال

اُردو زبان و ادب پر دوسری زبانوں کے اثرات

دنیا کی ہر زبان اپنے عہد اور علاقے کی ضرورتوں اور تسہیل کے تحت وجود میں آئی لیکن زبانوں کی تشکیل کے مراحل کے ضمن میں کوئی حد تنسیخ کھینچنا، اس لیے مشکل ہے کہ بولی کی شکلیں بتدریج جب زبان میں تبدیل ہو جاتی ہیں تب ہمیں اس کا علم ہوتا ہے۔

لٰہذا اُردو کی بھی یہی صورت حال ہے۔ اس لیے اِس زبان کی ابتدا کے مختلف نظریات کا ذکر اور اِس زبان نے دوسری زبانوں مثلاً سنسکرت، عربی اور فارسی سے کیا اثرات قبول کیے، اِس مقالے کا مقصد ہے۔

کسی بھی زبان کی ابتدا انسانی ضرورتوں کی دین ہوتی ہے، جیسے جیسے انسان کی ضروریات بڑھتی گئیں، اس کے ذخیرۂ الفاظ کو علیٰحدہ زبان کا درجہ ملتا گیا اور اِسی نہج و تدریجی ارتقا سے دنیا کی مختلف زبانیں وجود میں آئیں۔

اُردو کی ابتدا و آغاز کے بارے میں کئی مختلف نظریات ملتے ہیں اور یہ آپس میں اِس حد تک متضاد ہیں کہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن اِن نظریات میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتدا کی بنیاد برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمان فاتحین کی ہند میں آمد اور مقامی لوگوں سے میل جول اور مقامی زبان پر اثرات و تاثر سے ہوا اور ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جسے سب سے پہلے ہندوستان کی نسبت سے 'ہندوی' کا نام ملا۔

ماہر لسانیات حافظ شیرانی سے لے کر ڈاکٹر سینی کمار چٹرجی تک اس بات پر متفق نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں قدیم لغات اور ادبی تصنیفات میں بھی 'ہندی' یا 'ہندوی' ہی پایا جاتا ہے نیز ۸۱۲ھ میں قاضی خان بدر سے لے کر ۱۷۴۲ء میں سراج الدین خاں آرزو تک سبھی قدیم لغت نویسوں نے ہندوستان کی زبان کو 'ہندی' یا 'ہندوی' ہی درج کیا ہے اور بعض صوفیا کی تصنیفات یا اقوال میں بھی 'ہندی' یا 'ہندوی' کہا گیا ہے۔

'ہندی' یا 'ہندوی' کے بعد اردو کو 'ریختہ' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مختلف لغات میں ریختہ کے متعدد معنی ہیں۔ مثلاً بننا، ایجاد و اختراع کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا اور موزوں کرنا یا گری پڑی چیز وغیرہ ہے لیکن ابتدا میں ریختہ کا استعمال قطعی الگ معنی میں کیا گیا، یعنی مقامی راگوں اور فارسی کو ملا کر ہندوستانی

موسیقی میں جو اختراع وجود میں آئی اس کو ریختہ کہا گیا ہے۔ اسی لیے مختلف زبانوں اور مقامی بولیوں کے امتزاج کے سبب اسے اشارۃً اردو بھی کہا گیا اور بطور زبان 'ریختہ' شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں پہلی مرتبہ استعمال ہوا، لیکن یہ استعمال شاعری ہی محدود تھا۔ عام طور پر استعمال میں آنے والی زبان یا نثری کاوشات کے لیے 'ہندی' کا ہی چلن عام تھا، اس کی وجہ موسیقی تھی کیونکہ بعض قدما کے شعری کلام میں فارسی اور ہندوی کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

> ''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں، پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا اور یہ نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس ترتیب سے میں نے انہیں درج کیا ہے۔''
>
> (اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، ص۔۱۲)

اِس ضمن میں ماہر لسانیات پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''اردو کا وجود ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا اس طرح مرہون منت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد نئی زبان میں تیزی آئی، پہلے مسلمان جنوبی ہند میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ساحلی علاقوں کے باشندوں سے تجارتی تعلقات اور باہمی ربط وضبط سے ایک نئی مگر ٹوٹی پھوٹی زبان کی داغ بیل پڑ گئی جو کہیں گجراتی، کہیں دکنی، کہیں ہندوستانی کہلائی، اِس بنتی بگڑتی زبان پر وہاں کے علاقائی اثرات کا غلبہ رہا۔''
>
> (اردو زبان وادب کی تاریخ، ص (۱۴ تا ۱۵)

حالانکہ اِس ضمن میں کئی ماہر لسانیات نے اردو کی ابتدا کا سراغ قدیم آریاؤں کے زمانے میں لگانے کی کوشش کی ہے۔

بہر کیف اردو زبان کے محققین اگرچہ اِس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی لیکن مقام اور نوعیت کے تعین اور نتائج کے استخراج میں اختلاف پایا جاتا ہے البتہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ محمد بن قاسم سے شروع ہوتا ہے اور اِس سلسلے کی شروعات بارہویں صدی میں ہوتی ہے لیکن شروع میں یہ تمام حملہ آور سندھ سے ہی واپس چلے گئے تھے، اگر کچھ عرصہ ٹھہرے بھی تو اُن کا دائرہ سندھ تک ہی محدود رہا لیکن بعد کے حملہ آور جو درۂ خیبر کے راستے پنجاب میں داخل ہوئے، وہ طویل عرصہ تک ٹھہرے اور انہوں نے اپنی حکومتیں بھی قائم کیں۔ اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تحقیق قابل غور ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''مسلمانوں اور پنجابیوں کا میل جول عرصۂ دراز تک قائم رہا اور دونوں نے اپنی ضروریات کے لیے ایک دوسرے کی زبان کو اپناتے ہوئے برسوں گزار دیئے، جس سے ایک ایسی زبان کی شکل بن گئی جس میں ترکی، فارسی، پنجابی اور عربی سبھی زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے کھڑی بولی کا دبدبہ زیادہ تھا، جس کی شعری روایت نے عوام کے دلوں میں جلدی ہی اپنی جگہ بنالی۔''

(اردو زبان وادب کی تاریخ،ص ۱۵)

زبان کے ارتقا میں دولت آباد کی سرزمین کا بڑا دخل ہے، اِس سرزمین پر سب سے پہلے صوفیا اور مذہبی عمائدین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، حیدرآباد کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں اور مخطوطات کی شکل میں بہت سے رسائل موجود ہیں، اُن میں دو اہم شعری رسالے دستیاب ہوئے ہیں، ایک کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رسالہ ''سہاگن نامہ'' کے نام سے موسوم ہے جسے بندہ نواز گیسودراز کے والد سید یوسف شاہ قتال نے اپنی رحلت ۱۳۳۱ء سے قبل دولت آباد میں تحریر کیا تھا۔ اسی طرح ایک اور رسالہ ''زرلک نامہ'' دستیاب ہوا ہے، جس کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ اِس رسالہ کو زین الدین داد شیرازی نے دولت آباد میں سکونت اختیار کرنے کے بعد تحریر کیا تھا جو ۱۳۶۹ء سے پہلے کی تصنیف مانی جاتی ہے۔ اِن ابتدائی رسالوں کی زبان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ صوفیا اور مذہبی عمائدین کی مادری زبان عربی، فارسی یا ترکی تھی لیکن مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے دکن میں تبلیغی مقصد کے لیے مقامی باشندوں کی زبان کو استعمال کیا اور شاعری کی، جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کے بجائے سنسکرت، ہندوستانی الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

اردو ادب کا آغاز دہلی سے دور دکن میں پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی میں ہوا، شمال کے مغل حکمران عام طور پر فارسی کی سرپرستی کرتے تھے، جنوبی ہند (گولکنڈہ) موجودہ حیدرآباد اور بیجاپور میں نئی زبان (اردو) کو دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی جس کا پہلی مرتبہ ادبی استعمال صوفیا اور عوامی شعرا نے کیا، اِس لیے اس کا نام دکنی پڑا۔ نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' دکن میں شعری بیانیہ کا اوّلین نمونہ ہے۔ ملا وجہی کی تصنیف ''سب رس'' ایک مثالیہ داستان ہے، جس میں خیال وفکری اشیا کو متشخص کرکے پیش کیا گیا ہے، اِسے اُردو میں ادبی نثر کا پہلا کارنامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ دکن کے اہم شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، غواصی، ابن نشاطی، نصرتی اور ولی اورنگ آبادی وغیرہ کے نام خاص ہیں۔

ولی کے کلام سے متاثر ہوکر دہلی کے شعرانے اردو میں شاعری کی ابتدا کی اور اِس زبان کو شاعری کے لیے اتنا ہی موزوں تسلیم کیا جتنا فارسی کو کرتے تھے اور اس طرح اردو کی ترقی کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔

اُردو کسی ایک خطے کی زبان نہیں ہے، اِس کے بولنے اور سمجھنے والے اور اُسے مادری زبان کہنے والے آج پوری دنیا میں موجود ہیں۔ اُردو زبان نے مختلف اقوام سے رشتے قائم کیے اور اپنے دامن کو مالامال کیا، اِس لیے اِسے مشترکہ تہذیب کی علامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اور اِس نے دیگر بہت سی زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں جن میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ہندی، پنجابی، تیلگو، کنڑ، گجراتی اور مراٹھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہم اُردو کو سنسکرت کی ایک ترقی یافتہ شکل شورسینی اپ بھرنش پر پڑنے والے کئی زبانوں کے اثرات کا ثمرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اثرات باہر سے آنے والے ترک، عرب ایرانی اور انگریزوں کے مقامی لوگوں کے باہمی اختلاط کی وجہ سے مرتب ہوئے۔

زبان کے ساتھ ساتھ اُردو ادب پر عربی فارسی کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں، عام طور پر اُردو کی شعری اصناف فارسی سے آئی ہیں جیسے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ۔ داستانیں بھی اردو میں فارسی سے داخل ہوئیں۔ اُردو غزل کے اسلوب اور موضوعات، لفظیات اور استعارات عام طور پر فارسی سے آئے۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئے، فارسی کے طرز پر ہی اردو مثنویاں وجود میں آئیں، پہلے فارسی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ ہوا، بعد میں طبع زاد مثنویاں لکھی گئیں، یوں کئی صدیوں تک ہندوستانی سماج و معاشرہ فارسی کے زیر اثر رہا، فارسی نہ صرف ہندوستان کی سرکاری زبان تھی بلکہ اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔

شروع میں فارسی اور عربی کی داستانوں کا ترجمہ ہوا، عرب میں قبیلوں اور ایران میں بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھے جاتے تھے، اسی طریقے کو اُردو نے بھی اپنایا۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کی ساخت ہو یا ادب کی اصناف یا ہیئت سب پر عربی اور فارسی کے گہرے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

Dr. Arshad Iqbal
Asst. Professor
M. M. (P.G.) College
Katghar
Moradabad
(UP)
Mob.- 09412838013:

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ضیا

حاؔلی کی رباعیوں میں اخلاقیات ونفسیات

الطاف حسین حاؔلی کے تعلق سے اردو ادب میں اتنے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے جا چکے ہیں کہ ان کا شمار کرنے کے لئے بھی الگ سے ایک کیٹلاگ تیار کیا جا سکتا ہے۔علمی اعتبار سے جو مقام ومرتبہ اردو کے اربابِ ثلاثہ یعنی میؔر، غالؔب اور اقبال کے حصے میں آیا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن ہم حاؔلی کو بھی اگر فہرست میں شامل کر لیں تو یہ وہ اربابِ اربعہ ہو جاتے ہیں جن کی شخصیات کے سامنے باقی تمام ادبی چراغ ممنون دکھائی دیتے ہیں۔اس بات سے میری مراد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ مذکورہ شخصیات کے سوا اردو ادب خالی ہے لیکن میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان کا تذکرہ کیے بِنا اردو ادب کی تاریخ ادھوری ضرور ہے۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اردو تنقید کو جو معیار و وقار مقدمہ شعر وشاعری نے عطا کیا ہے اگر نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اردو تنقید کا دامن اتنے کم عرصے میں اس قدر وسیع تر نہ ہو پاتا۔حالانکہ ہمارے یہاں حاؔلی کی اس روش سے بہت جلدی کنارا کش ہونے والے ادبی نظریات ومہمات کا آغاز ہوا جو اپنے اپنے دور میں اردو ادب کے لئے بقائے دوام بھی ثابت ہوئیں۔جیسے مارکسی تنقید، جمالیاتی تنقید، جدیدیت و مابعد جدیدیت وغیرہ کے رجحان نے اردو ادب میں سوچ کے نئے دروازے واہ کیے۔ہر دور میں تنقید وتحقیق کا اپنا معیار ہوتا ہے اس کے کچھ مسلمہ اصول ہوتے ہیں انہی کے وسیلے سے ادب کے مستقبل کا راستہ طے پاتا ہے۔

حاؔلی ہر اعتبار سے ایک بڑے مصنف، نقاد، تخلیق کار و مبلغ تھے۔اور ان کی تصنیفات میں شاہکار کا درجہ کس تصنیف کو دیا جائے یہ بھی ایک مشکل کام ہے اس کے لئے میرے خیال میں کوئی طے شدہ یا مقررہ اصول اور ضابطہ تو ہے نہیں۔ہاں لیکن مقدمہ شعر وشاعری کو یہ مقام ضرور حاصل ہے کہ وہ نہ صرف حاؔلی کی شاہکار ہے بلکہ اردو ادب کی اگر چند کتابوں کا نام ایک سانس میں گِنانا مقصود ہو تو ایک ان کا ''مقدمہ شعر وشاعری'' بھی ہے۔حاؔلی کا نام اردو شاعری میں بھی یکتائے روزگار تھا جس کی مثال ان کی نظموں، مثنویوں، یا غزلیات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔حاؔلی کی غزلوں کے مضامین میں غالؔب کے اندازِ فکر کی ہلکی پھلکی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور فریبِ سود وزیاں کا تذکرہ بھی نظر آتا ہے۔ان کی نظمیں اردو دنیا میں فکر کی بنیادیں قائم کرنے والی بنیادو اثاثہ کی حیثیت کا سرمایہ رکھتی ہیں۔یہاں اس مقالے میں میری کوشش ہے

کہ حالی کی رباعیات میں ان کی ذہنی فکر اور ان کی اس کائنات کا جائزہ لیا جائے۔

حاؔلی کی رباعیاں محمد رحمت اللہ رعد نے مرتب کی ہیں جن سے میں اس مقالے کے لئے استفادہ کر رہا ہوں، حالانکہ موصوف کی مرتبہ کوشش میں اس طرح کا کوئی تحقیقی مضمون شامل نہیں ہے۔اتر پردیش اردو اکادمی کی وساطت سے صرف رباعیوں کو یکجا کیا گیا ہے۔اس چھوٹی سے کتاب میں شامل رباعیوں کے مضامین بڑی خوبصورتی سے سرِ ورق دیے گئے ہیں۔جیسے شروع میں حمد ہیں اس کے بعد نعت اور پھر اس کے بعد کچھ مضامین اس طرح ہیں۔صلح کُل ،ترک شعر عاشقانہ ،پیران زندہ دل ،نیکی اور بدی پاس پاس ہیں،امتحان کا وقت، عشق،نیکوں کی جانچ ،دوستوں سے بیجا توقع ،شراب اور جوانی ،غرور سب عیبوں سے بدتر ہے،گفتار و کردار میں اختلاف،شرط قبول،طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بننا چاہیے عالم اور جاہل میں کیا فرق ہے،موجودہ ترقی کا انجام، مسرف کو کیونکر فراغت حاصل ہو سکتی ہے،کام کی جلدی،غرض،انقلابِ روزگار،تقاضائے سِن ،جس کو زندگانی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا،آثارِ زوال،شان ادبار،عزت کس چیز میں ہے،توقع بیجا،عقل اور دوستی متضاد ہیں،عیش وعشرت،غیبت،عشق،سبب زوالِ سلطنت،دین ودنیا کا رشتہ،ازدگانِ استبازی کی تکفیر،بے پروائی و بے غیرتی،عفو باوجود قدرتِ انتقام،سختی کا جواب نرمی سے،ہمت،کم ہمتی، پشیمانی،تاسف بروفات نواب ضیاالدین احمد مرحوم نیر تخلص دہلوی،تاسف،محنت،گدائی کی ترغیب،تکفیر اہل اسلام،ترک عاشقانہ گوئی ،تنزل اہل اسلام،اول کوشش اور بعد دعا،کام کرنا جان کے ساتھ ہے،جھوٹی نمائش،چند بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے،سکوت درویش جاہل،ملحدوں کا ملعون مسلمانوں پر،دہری کا الزام گور پرست پر،دانا کا حال نادانوں پر،ریفارم کی حد،اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا،حُسن ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا،دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں،فکرِ عقبیٰ،انسان کی حقیقت،سلاطین کا عشق وقت کی مساعدت،بڑھاپے میں موت کے لئے تیار رہنا چاہیے،دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے،حد سے زیادہ غصہ قابل عفو ہے،سفہا کی کی مدح وذم،مرضِ پیری لاعلاج ہے،اسراف،رد سوال، کھانا بغیر بھوک کے مزہ نہیں دیتا،علم وعمل کا سرمایہ مال ودولت سے بہتر ہے،اچھوں کو برا سننے میں بھی مزہ آتا ہے،شکریہ مدح کلام راقم ،احسان بے منت، قانون بداخلاقی سے مانع نہیں ہوتے ،مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر ہے،ٹیکس،انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے،واعظوں کی سخت کلامی۔

مندرجہ بالا سبھی مضامین میں کچھ باتوں کا ایک مشترکہ حاصل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حاؔلی انسانی بقا اور اس کے علاج کے مرحم ڈھونڈتے دکھائی دے رہے ہیں۔اگرچہ مضامین کو پیش کرنے میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے پھر بھی اپنی کوشش سے جو ممکن ہو سکا اس درجہ ایک فہرست تیار کی ہے۔یہ مضامین بظاہر ایسا لگتا ہے کہ خطیبانہ فکر اور پیغام پر مبنی ہیں، لیکن ان میں شاعر کی جو سوچ انسان کے بنیادی مسائل کو پیش کرتی دکھائی دے رہی ہے وہ اخلاق وتہذیب کی ٹوٹتی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش ہے۔مسائل کو پیدا کرنے کے بجائے

پہلے سے موجود پریشانیوں کا حل تلاش کیا گیا ہے۔لیکن اس ساری کوشش میں حآلی کی سوچ اوران کے ذہنی سفر کا اہم رول ہے۔ان کی منکسرانہ مزاجی نے بارہا ایسے حالات پیدا کئے ہیں جن کی روشنی میں ان کی تحریروں کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔حآلی کے تعلق سے جب بھی بحث کی جائے گی ان کی طبیعت کو یادرکھنا چاہیے۔وہ ایک رباعی میں لکھتے ہیں ؂

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ تخم   ہوتے نہیں ساتھ جمع۔دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حُسن گفتار   بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

حآلی یہ مضمون اپنی رباعی ''گفتار وکردار میں اختلاف'' کے ضمن میں لکھ رہے ہیں۔یہاں ان کے اندازِ فکر کا تعلق ذہنی سفر سے ہے۔حآلی کی نظر میں جو انسان حُسن گفتار کی دنیا میں مقبولیت حاصل کر لے اس کے کردار کا کم پڑ جانا دو طرح کی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔کردار سے یہاں پر شخصیت کی خارجی دنیا بھی ہے۔اور سوچ سمجھ سے کردار کا تعلق فکر کے زاویوں سے بھی ہے۔اگر کوئی انسان حسن گفتار کی بنیاد پر فکر کا دائرہ محدود کر لے تو حآلی کا اندازِ فکر اس سے قبول ہی نہیں کرتا کیونکہ وہ بذاتِ خود منکسر المزاجی کے پیکر تھے۔اسی طرح کسی کے خارجی دُنیا میں محض لفاظی سے یا اوراس کے گورکھ دھندوں سے رعب داب قائم کرنے پر بھی وہ معترض دکھائی دیتے ہیں۔حآلی جب توحید کا خالص فلسفہ بیان کرتے ہیں تب خدا بزرگ و برتر کے سامنے ہر شے کو ہیچ مانتے ہیں جیسے ؂

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا   حلقہ ہے ۔ہر گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور   بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیر

حآلی یہاں بھی انسان کی اس حقیقت کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے ذیل میں کوئی بشر خدا سے نا آشنا ہو ہی نہیں سکتا۔اندازِ فکر کو دیکھئے کہ رب لم یزل کوئی دل سے مانتا ہے مگر اس کے دل میں اٹکا ہوا ہے،دل کے اندر نہیں ہے کیونکہ حآلی نام نہاد خدا لیواؤں کو قبول نہیں کرتے تھے یعنی نیم خدا شناسی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے،مگر دل پر لٹکے ہوئے اس نام کو دل کے پاس رکھا ہے بس یہاں تک تسلیم کرتے ہیں اور جب دوسرے طبقوں سے خدا کے رشتے کو واضح کرتے ہیں تب ان کے کانوں سے اس کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔آسان جملے میں کوئی مانتا ہے مگر دل کے پاس اس میں بھی ضم نہیں ہے اور کوئی سنتا ہے تو وہ بھی اس نام سے محفوظ نہیں ہے۔کوئی مانتا اور کوئی جانتا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر ایک مذہب یا مکتبہ فکر میں خدا کی ذات کا تصور یا تو انکار کی شکل میں ہے یا اس کی تابعداری کا عمل موجود ہے۔لیکن کوئی بھی ایسا نہیں جو محرمِ ذاتِ کبریا نہ ہو۔اسی طرح ایک اور رباعی میں لکھتے ہیں ؂

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا   آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے   انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

جیسے پہلی رباعی میں حآلی ہر انسان سے مجبوراً یا مسروراً خدا کی ذات سے آگاہی کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح اس رباعی میں انہوں نے دنیاداروں اور بُت پرستوں کو بھی غرقِ عشقِ حضورِ خداوندِ قدوس ثابت کیا ہے۔یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے تا حال لوگ بیان کرنے سے کتراتے ہیں اور رب کی ذات سے بھی اپنے آپ کو سب سے زیادہ منسلک پاتے ہیں نہ کہ یہ کے دوسروں کو بھی اسی کی مخلوق مانا جائے اور اس سے باتعلق دیکھا جائے۔حآلی کی ذہنی فکر اور کائنات سے ان کی رواداری کا اندازہ ان تمام رباعیات میں لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے خدا کی شان میں لکھی ہیں۔پھر جب وہ نعتِ سرورِ کونین پر لکھتے ہیں تو یوں کہ ؂

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف   یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر   آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

یعنی محمدِ عربی ﷺ کی ذات اقدس ہی وہ شخصیت ہے جو وجہِ تکریم کائنات و شہر خاص الخاص جہاں آپ پیدا ہوئے اور جہاں رہے، ہے۔اور نہ کہ صرف ہماری نئی نسل یا اُمتِ خیر الاُمم کو آپ کی ذاتِ اقدس پر فخر ہے بلکہ ہمارے اجداد کے آبا ہونے کو بھی آپ کی ابوّت سے شرف تھا۔اور ان کی تقدیس کی وجہ بھی آپؐ تھے یعنی نعت گوئی کو حآلی نے بندگی سمجھا اور سرورِ کائنات کی تعریف کے اصلی جوہر تک پہنچنے کی کوشش کی ۔حآلی کی نعت گوئی کا معیار دیکھا جائے تو اس دور میں بہت کم لوگ ان کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔یہ تو وہ مضامین ہیں جو حآلی کی مسدس میں بھی ہیں اور ان کا والہانہ بیان اس کے تحت کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ وہ رباعیاں جن کی ایک لمبی فہرست ہے کے اکثر مضامین سر سید کے منتخب اندازِ فکر کے ساتھ یا اس کے آس پاس دکھائی دیتے ہیں۔جیسے ایک رباعی پیرانِ زندہ دل میں اس طرح لکھتے ہیں ؂

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح   ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُنکے ہیں ظرف اُنکے جو کرتے ہیں ٹیر   ہنس بول کے پیری کو جوانی کی طرح

اور یوں ہی نیکی و بدی کو جب پاس پاس دیکھتے ہیں تب اس کے ضمن میں لکھتے ہیں ؂

جو لوگ ہیں نیکوں میں مشہور بہت   ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود ایک بدی ہے ،اگر ہو نہ خلوص   نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

کیا ایسے فلسفے کو آج اس صدی میں اہل تقویٰ ماننے کو تیار ہیں یا اس سے قبول کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک سوال ہے جس کا تعلق اس سمجھ سے جہاں انسان کو اپنی نیکی میں خلوص کا زوال دکھائی دے۔اور وہ یہ ماننے پر آمادہ نہ ہو کے اس کی نیکیاں ہی دراصل سببِ زوال ہوتی جا رہی ہیں۔جس میں اس نے شہرت تو حاصل کر لی لیکن قبولیت کے معیار کو نہ پہنچ سکا۔لکھنوی شاعری کے جن اصولوں سے حآلی ناراض تھے یا اردو

غزل کے جن مضامین سے انہیں اکتاہٹ ہوتی، یا مقدمہ شعروشاعری کے لئے انہوں نے جو طریقے بتائے ہیں انہی وہ اپنی رباعیوں میں بھی کرتے ہیں۔ عشق کو حالیؔ ایک فضول شے سمجھنے پر مجبور تھے کیونکہ عشق کا جو واہیات اور مکروفریب سے بھرپور اور عورت کے جسم کے خارجی جسمانی خدوخال کا مظاہرہ ان سے قبل ہو چکا تھا اس کے بھونڈے پن سے وہ خوش نہ تھے لہٰذا ایک رباعی میں لکھتے ہیں۔

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر
ایک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

پھر عشق کے ہی مضمون کو ایک دوسری رباعی میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اے عشق کیا تونے گھرانوں کا تباہ
پیروں کو خَرِف اور جوانوں کو تباہ
قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری

ظاہر سی بات ہے حالیؔ جس مضمونِ عشق کو زیرِ بحث لا رہے ہیں اس کا ڈھانچہ ان سے پہلے پاکیزہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس سے لوگ اتنی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اس عشق میں کوئی ایک ایسی بات نہیں تھی جو سچے عشق کی پہچان کرا سکے، وہ تو بس محبوب کی موہوم کمر سے جُڑا ہوا تھا اور اس سے نسوانی لب ورخسار صاف جھلکتے دکھائی دیتے تھے۔ اس اعتبار سے قوموں کی رسوائی اور خاندانوں کی ذلالت کو اس کے آئینے میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حالیؔ نے واقع ہی ایک مصلح کا کام بھی کیا ہے۔ حالیؔ تو عورت کے جسم کے زاویوں سے نکال کر عشق کی سچی روح کو پانے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے انسانی جذبات کی عکاسی کے آلۂ کار شاعری کو تخیلات کی بلندی پرواز کا سبق دینے کی کوشش کی اور اس کے سڑیل انداز کو سرے سے خارج کرنے پر زور دیا۔ حالیؔ دنیا و دین کے رشتے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

دنیا کو دیے دین نے اسرار حِکَم
دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

اس طرح وہ دنیا و دین کو دو الگ چیزیں ماننے کے باوجود دونوں کے باہمی رشتے کے قائل ہیں اور ایک کے بِنا دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ جب تک دنیا کا قیام ہے دین اسی کے ساتھ چلے گا، کیونکہ دین کا وجود عالمِ بالا میں ہونے سے زیادہ اس کا عملی تصور عالمِ ہستی میں ہی ممکن ہے۔ حالیؔ کی سوچ اور سمجھ بوجھ نظریہ سازوں سے بھی اس وقت بڑی دکھائی دیتی ہے جب وہ سلطنت کے زوال کی وجہ بتاتے ہیں۔

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

حالیؔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو دیکھ سمجھ اور پڑھ چکے تھے اور انہوں نے اس کی بربادی کے جو اسباب دیکھے

ISSN : 2582 - 3612

ان میں سے دو کا ذکر یہاں اس رباعی کے ذریعے کر دیا ہے تاکہ مستقبل میں ان دونوں کا لحاظ رکھا جا سکے۔ وہ ایک تو لہوولعب اور تعیش پسندی کو اسبابِ زوالِ سلطنت مانتے ہیں اور دوسرے مذہب کے پیشوا جو اپنے نجی فیصلوں کو ملک یا ریاست کے مشترکہ ماحول پر فوقیت دیتے ہیں۔ اگر حالی کی اس رباعی کو موجودہ سیاسی حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے طے شدہ اسبابِ زوال ہر چند کے موجود ہیں اور بجا طور پر متحرک نظر آتے ہیں۔ حالیؔ انسان کے مزاج اور اس کی نفسیات سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجئے تسکیں
زہر اُگلے کوئی تو کیجیے باتیں شریں
غصہ غصے کو اور بھڑکا دیتا ہے
اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

حالانکہ وہ نفسیات کے نہ ہی تو امام تھے اور نہ ہی ان کی اس میدان سے ذاتی دلچسپی رہی ہے۔ پھر بھی ایک تخلیق کار جب کسی فن پارے کو عالمِ دوام کی سی حیثیت بخشتا ہے تب اس کی اپنی سمجھ اور اندازِ فکر نفسیاتی طور پر ہزارہا ایسے مضامین کو قبول کر لیتی جو انجانے میں اس کے تحت الشعور کا حصہ ہوتے ہیں بالکل یونہی جیسے ایک گاڑی چلانے والا اپنی سمجھ سے زیادہ دور چل رہا ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں بریک تو ہے مگر دماغ گاڑی کی رفتار سے تیز ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا ذہنی سفر ہے جس میں ادیب ایسے حالات پیدا کر لیتے ہیں جہاں ان کی نظر چند انجان واقعات پر پہنچ جاتی ہے۔ حالی غصے کا دائمی علاج نہیں بتا رہے بلکہ اس سے حد میں رکھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ قوم کی سست رفتاری سے بھی ناراض تھے اس کے اطوار کو درست ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

حالیؔ شاعروں کے افسانوی جہان سے دور رہنے اور عقل کی قریب رہتے ہوئے مستقبل میں کامیابی کے خواب دیکھتے تھے۔ اسی لئے جس بات کو انہوں نے اپنے تنقیدی نظریے سے بیان کیا اس کا ذکر اس رباعی میں بھی کیا ہے کہ ہمیں افسانۂ قیس وکوہکن کے بجائے اپنی خبر ہونی چاہیے۔ توہم پرستی اور بھروسہ دو الگ چیزیں ہیں لیکن بھروسے میں بھی کوشش کا ہونا ضروری ہے بِنا کوشش کئے کوئی دعا کرنا یا دعاؤں کے سہارے محنت کا دامن چھوڑ دینا ناکامی کی وجہ بن سکتی ہے۔

کوشش میں ہے شرط ابتدا انسان سے
پھر چاہیے مانگنی، مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفان سے

یہاں تک میں نے الطاف حسین حالیؔ کی جن رباعیوں کا ذکر کیا ہے اور اس سے طویل مضمون لکھنے کی اس مقالے کے تحت گنجائش نہیں ہے۔ اور ان کی سبھی رباعیوں کا جائزہ لینے کے لئے اس بھی طویل مقالہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

درکار ہے۔لیکن ان کے اس مطالعے سے میں جس نتیجے پر پہنچ پایا ہوں ممکن ہے ہم میں سے کوئی دوسرا اس سے اختلاف بھی رکھتا ہولیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حالؔی جس طرح باقی اصنافِ ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں اسی طرح وہ اپنی رباعیات میں بھی اپنا ایک الگ رنگ وآہنگ سامنے لاتے ہیں۔ان کی جو رباعیاں مجھے مِل پائی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ انسانی ترقی کا راز مافوق الفطری عناصر کے ساتھ نہیں دیکھتے تھے اور نہ ہی عشق کے گھٹیا پن کو تسلیم کرتے تھے۔قومی اخلاقی اور مذہبی نوعیت کی ان رباعیوں میں انسانی عروج و زوال کے اسباب کی وجوہات بھی موجود ہیں اور انسانی کردار کو بہترین بنانے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔ اسی طرح انسان کے علم وعمل کو سچائی سے جوڑنے اور قدروں کی سلامتی کا ذکر بھی کیا ہے۔ان رباعیوں میں انسانی معاشرت وسماجی رہن سہن کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔حالؔی نے ان رباعیوں میں مذہب ومِلت اور عالمی برادری کے روایتی اصولوں میں چند اضافے کے ساتھ نئے ماحول اور بدلتے عہد کی تصویر پیش کی ہے۔ چند رباعیوں میں ان کے اپنے تنقیدی مضامین کی تائید ہے اور بعض جگہوں پر سرسید احمد خان کے نثری مضامین کی شعری شکل دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح ان کے رفقا اور ہمعصروں کے بھی ان کی شخصیت پر جو تاثرات تھے وہ ان کی رباعیوں میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔اور اسی سے ان کے ذہنی فکر اور اندازِ زندگی کا پتہ معلوم ہوتا ہے۔ المختصر حالؔی جتنے اچھے نثر نگار، نظم نگار، مثنوی نگار، تنقید نگار، غزل گو شاعر ہیں اتنے ہی اعلیٰ اور معیاری رباعی گو شاعر بھی ہیں۔میں ان کی لگ بھگ ستّانوے رباعیوں کا مطالعہ کرنے کے اس مقالے کو پیش کر رہا ہوں، جو خاص یا مشترکہ باتیں میری سمجھ میں یا اس مضمون میں حالؔی کی رباعیوں کے اندازِ فکر کو سمجھنے کے لئے ضروری تھیں انہیں آپ کے سامنے لانے کی ایک کوشش کی ہے۔حالانکہ سبھی رباعیوں کو اس مختصر سے مقالے میں یکے بعد دیگر پیش کرنا مشکل ہے اس لئے حالؔی کی رباعیات میں جو ایک فکر ہے، قوم اور ملت یا ملک کے لوگوں کو کس طرف لے جانے کا منصوبہ رکھتے تھے اس کی مختصر سی تصویر سامنے لائی گئی ہے۔حالؔی کی رباعیاں اردو ادب کی رباعیات کی تاریخ میں نہ کہ صرف اضافہ ہیں بلکہ رباعیوں میں جو اخلاقی مضامین کا اپنا مقام ومرتبہ ہے اس کو انہوں نے ملحوظِ خاطر رکھا ہے، اس لئے حالؔی کی رباعیات کا ذہنی سفر جو اخلاقی پیغامات کا گہرا مشاہدہ ہے ان کا مطالعہ نئی نسل کے لئے راہ مستقیم فراہم کرسکتا ہے اور اس راہ پر چلنے سے پہلے اخلاقی تعلیم کا زیور پہننا بہت ضروری ہے۔اور یہ اخلاقی تعلیم بھی خواجہ الطاف حسین حالؔی دے سکتے ہیں۔

Dr. Ghulam Mustafa Ziya
Deptt. of Urdu
Govt. Degree College
Sarnacot, Punchh
(Jammu & Kashmir)
Mob.- 7889368623

ڈاکٹر گل افشاں شمیم

ناول ''مٹی کے حرم'': ایک جائزہ

اردو زبان وادب میں صنف ناول نگاری کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ابتدا سے اس صنف سخن نے انسانی زندگی کے مختلف شیڈس کو طشت از بام کرنے میں اپنی فعالیت کا احساس کرایا ہے۔اس صنف کو عروج کے زینے طے کرانے میں مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی اہم رول رہا ہے۔ناول مٹی کے حرم ساجدہ زیدی کا بہترین ناول ہے اس ناول پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے قبل میں چند گفتگو صنف ناول کے حوالے سے کرنا چاہوں گی تاکہ اس بابت اس ناول کا بھی فنی جائزہ لیا جاسکے۔صنف ناول کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> ''ناول قصے کہانی سے قدرے مختلف ہے۔کہانی انسان کے ساتھ وجود میں آئی۔ ناول کا صحیح معنی میں آغاز اس وقت ہوا جب سماج نے ایک خاص منزل تک ترقی کرلی۔انگریزی لفظ ناول کے معنی نئے کے ہیں اور انگریزی میں قصہ نگاری کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس کا انداز پرانی داستان یا قصہ نگاری کے مقابلے میں نیا تھا۔ناول اس نثری صنف کو کہا جاتا ہے جس میں ایسا حصہ بیان کیا گیا ہو جو زندگی کی ترجمانی تسلسل کے ساتھ کرتا ہو۔ناول کا فن دراصل معاشرتی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا فن ہے۔ ناول نگار اپنے فکر وخیال سے ایک نئی حقیقت کو خلق کرتا ہے جو دراصل زندگی کی حقیقت سے ماخوذ ہوتی ہے۔''
>
> (اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۵)

اردو ناول کی تاریخ اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ اس صنف میں ابتدا سے خواتین قلم کاروں نے اپنی شمولیت درج کرائی ہے۔ یہ سلسلہ رشید جہاں سے لے کر ابھی تک قائم ہے۔ جس طرح رشید جہاں نے اپنے ناولوں کے حوالے سے عورتوں کی محرومی اور حقوق کو سامنے لایا اسی طرح ہر عہد کی خواتین ناول نگاروں نے بھی اس ضمن میں بہترین ناول لکھ کر اپنی قلمی معاونت دی۔آج ہم ناول نگاری کے

عصری منظرنامہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بیشتر خواتین ناول نگار ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، غزال ضیغم، ساجدہ زیدی کی تخلیقات بیش بہا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ساجدہ زیدی کے اب تک دو ناول موج ہوا پیچاں اور ''مٹی کے حرم'' منظرعام پر آچکے ہیں مصنفہ نے ناول مٹی کے حرم میں انسانی نفسیات کی بہترین تصویر کشی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''ساجدہ زیدی نے بہت سے بے نام جذبوں اور مبہم کیفیتوں کو فکری سطح پر لے جا کر انہیں معنویت دینے کی کوشش کی ہے.......... کچھ لازوال فطری سلسلے ناقابل تغیر انسانی فکر کی روش زماں و مکاں کی گردشوں سے ماورا انسانی معاشرے کی کچھ سچائیاں اور ایک ناقابل تسخیر، لیکن رکھا تھا جذباتی ریلا۔''

(اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۹۰)

یہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند نے انسانی زندگی کو کئی رخوں سے متاثر کیا تھا اور اس تقسیم کے منفی اثرات نے انسانی سوچ کو تھوڑی دیر کے لئے مضمحل کر رکھا تھا۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ مختصر یہ کہ ساجدہ زیدی کا فنی کمال یہ ہے کہ آپ نے صرف تقسیم ہند کے منفی اثرات کے بیان تک ہی اس ناول کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے کس طرح لوگوں کو کیمپوں میں قیام کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور انسانی احساسات و جذبات پر کاری ضرب لگ رہا تھا، ان تمام پہلوؤں کو یہ ناول سامنے لاتا ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''مصنفہ نے زندگی کی تگ و دو اور انفرادیت کی تلاش میں سرگرداں کرداروں کی آرزوؤں، محبتوں، تنہائیوں اور محرومیوں کی داستان رقم کی ہے۔ یہ زماں و مکاں کے تناظر میں بدلتے ہوئے رشتوں اور اقدار جیتے جاگتے کرداروں کی زندگی کا ایسا فسانہ ہے جو کہیں احساس کی سطح پر بہتا ہوا نرم رو دریا ہے کہیں جذبات کی تموج اور تلاطم کا پرشور سمندر اور کہیں انسان کے روحانی کرب کا المیہ۔ اس میں متوسط طبقے کی وہ آگ ہے جو لہو بن کر آنکھوں سے ٹپکتا ہے اور سماجی و طبقاتی نابرابری کے خلاف احساس کی تپش اور روح کی تڑپ ہے جو اس طبقے کو ہمیشہ لہولہان رکھتی ہے۔''

(اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ص-۳۷۶)

ساجدہ زیدی نے یہ ناول لکھ کر اردو ناول کو ایک نیا لب و لہجہ اور نیا طرز اظہار عطا کیا ہے۔ آپ نے اردو ناول کو انسانی زندگی سے قریب کرتے ہوئے بیانیہ اسلوب کو فوقیت عطا کی ہے۔ موضوع کی پیشکش ہو یا تکنیکی عناصر، ہر اعتبار سے یہ ناول بیش بہا کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ واقعہ نگاری، کردار نگاری، پلاٹ

ISSN : 2582 - 3612

سازی، جزئیات نگاری، مکالمہ نگاری اور اسلوب نگارش ہر سلسلے سے یہ ناول ساجدہ زیدی کے فنی اختصاص کو بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول دو دہائی کے بعد بھی اپنی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

ترقی پسند عہد میں جس طرح انسانی نفسیات کی عکاسی میں عصمت کا قلم سبقت لے جاتا نظر آتا ہے اسی طرح ناول کے عصری منظرنامے میں نگاہ ڈالیں تو ناول مٹی کے حرم کی مصنفہ ساجدہ زیدی کو بھی یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے بھی انسانی نفسیات کی بہترین ترجمانی کرنے میں اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ میں یہ عرض کردوں کہ پورا ناول فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آئے ہوئے افراد کا جس طرح نوحہ بیان کرتا ہے اسی طرح ان افراد کی ذہنی کیفیت اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ گھر کا ویران ہونا ایک شہر سے دوسرے شہر ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنا محبت کے لٹنے یا یوں کہیں کہ ناتمام محبت کی کسک کس طرح ہندوستانی عوام کو کمزور بنا چکا تھا ان تمام پہلوؤں کو مصنفہ نے حقیقی پس منظر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ یہ ناول موضوع اور پلاٹ کے حوالے سے انفرادیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے سے مصنفہ فرماتی ہیں :

''مجھے جتنی تخلیقی ترغیب اپنے باطن کی آوازوں سے ملی اپنے روحانی اضطراب المیہ احساس اور ذاتی غموں کے ارتعاش سے ملی۔ اتنی ہی خارجی حالات کے تقاضوں سے، انسانی المیوں سے ناانصافیوں سے سفاکیوں سے........... ایشیا و افریقہ کی زمین پر پھیلے ہوئے کشت و خون کے مناظر اور ظلم واستحصال و مظلومی و محرومی کے نظاروں سے اور وطن کی عزیز کی گلیوں میں بہنے والے خون کی ندیوں سے ....اور یہ ترغیبات رگوں میں اتر کی باطن کی آوازوں میں شامل ہوتی رہیں۔''

(اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۹۰)

مختصر یہ کہ اس ناول میں ساجدہ زیدی نے انسانی تمناؤں اور محرومیوں کو پیش کیا ہے۔ پورا ناول مصنفہ کے مشاہداتی قوت اور تجربے کی گہرائیوں کو عیاں کرتا ہے وہ یہ کہ جس طرح فرقہ وارانہ فسادات کے زیر اثر انسانی زندگی نامساعد حالات کا شکار ہو چکی تھی اور انسانی احساسات کی معنویت صفر ہو چکی تھی ان تمام امور کو مصنفہ نے بہ حسن وخوبی سامنے لایا ہے۔ اس سلسلے سے ناول کا یہ اقتباس دیکھئے :

''خوابوں کی طرح یادوں میں کوئی تسلسل ہوتا ہے نہ ان کی کوئی منطق۔ کبھی یاد کی موجوں پر چہرے ابھرتے تو ابھرتے ہی چلے جاتے۔ موج در موج اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ طلوع ہوتے پھر غروب ہوتے........... پھر طلوع ہوتے پورے وجود کو اپنے دائرہ میں محصور کر لیتے ان کی نظر میں ان کی آوازیں ان کی محبتیں، ڈانٹیں، دلداریاں اس کے گرد جال سا بنا دیتیں۔ وہ تصور میں ان سے ہم

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کلام ہوتی اپنے دل کا درد کہتی۔ ان سے اپیل کرتی جیسے وہ ان کی مدد کو ہی جائیں گے۔ کبھی وہ خالی ذہن سے گھومتی پھرتی وہ سب چہرے معدوم ہوجاتے۔ اپنی جھلک بھی نہ دکھاتے۔ ہر کیفیت فراموش گاری کے دھندلکوں میں کھو جاتی اور وہ خود اپنے موجودہ ماحول کی بے سمتی اور بے یقینی میں غروب ہونے لگتی۔''

(ناول مٹی کے حرم، ساجدہ زیدی، ص-۵۱)

یہ پورا ناول انسانی احساسات کی جس طرح ترجمانی کرتا ہے وہ قابل اعتنا ہے۔ ناول کے مطالعہ کے دوران کرداروں سے عجیب سی انسیت محسوس ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ ناول ہمارے ذہنوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جس طرح یہ ناول اپنے تمام فنی لوازمات کے اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے اسی طرح اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ ناول اپنی پراسراریت کا لوہا منواتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کا اسلوب، روانی، سادگی، سلاست کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کا دانشورانہ طرز اظہار خوب سے خوب تر ہے۔ تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ ناول مٹی کے حرم کو تحریر کر کے مصنفہ نے اردو ناول نگاری کے دامن کو وسعت عطا کی ہے۔

Dr. Gul Afshan Shamim
Head
Deptt. of Urdu
J. D. Women's College
Patna
(Bihar)
Mob.- 78579 96992

محمد نصیر احمد

سرسید احمد خان اور نظریہ تعلیم

سرسید احمد خان ۱۷/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو متقی خان کے گھر پیدا ہوئے جنھیں سرسید کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ سرسید احمد خان نظریہ ساز انسان تھے۔ انیسویں صدی میں اصلاح معاشرہ اور تجدید احیائے دین کے غرض سے جتنے بھی اہم لوگ پیدا ہوئے ان میں ایک اہم نام سرسید کا بھی ہے۔ آپ کو برصغیر میں مسلم قوم پرستی کا سرخیل تصور کیا جاتا ہے۔ یوں تو سرسید مغلیہ عہد سلطنت میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر برطانوی راج کے بھی گواہ ٹھہرے۔ جب دورِ مغلیہ زوال پذیر ہوگئی اور برطانوی دورِ حکومت کا زور بڑھا تو اس وقت آپ کئی اہم عہدے پر فائز رہے۔ مگر قوم کی فکر اور قوم کے لیے کچھ کر گزرنے سے کبھی غافل نہیں ہوئے، ان کا خاصہ تھا کہ وہ ہر پہلو میں مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرہ اور تعلیم و تنظیم کا پہلو ضرور نکال لیتے تھے۔ وہ سوتے جاگتے اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اپنی قوم کی ترقی اور بھلائی کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ جبکہ برطانوی راج میں اتنا سرگرم ہو کر قوم کے لیے اتنا اہم کام کرنا ایک طرح سے جرم تھا مگر سرسید احمد خان نے حکومتِ برطانیہ کو ہر اعتبار سے اعتماد میں لے رکھا تھا اور انھیں بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم میں آگے لایا جائے اور انھیں نوکری دی جائے اور برسرِ روزگار کیا جائے تاکہ وہ ملک کی ترقی میں حصہ دار بن سکیں ورنہ اگر ملک کی ایک آبادی کمزور، بے روزگار اور غیر تعلیم یافتہ رہے گی تو دوسری قوم لاکھ پڑھ لکھ لینے کے باوجود اور نوکری حاصل کرنے کے بعد بھی ملک کے نقشہ میں ہر ارنگ اکیلے نہیں بھر سکتی ہے اس لیے کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس ملک کی کل آبادی کی ترقی کی جائے اور انھیں مین اسٹریم میں لایا جائے، جس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ نہ صرف برطانوی حکمراں اس بات کو سمجھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کی ترقی اور بھلائی کے لیے فکرمند ہوئے اور جگہ جگہ روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے ان کی تعلیم کا نظم کیا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ جلد از جلد مسلمانوں کو بھی ملک کی دوسری آبادی کی طرح ترقی یافتہ کر دیا جائے۔ سرسید کی محنت کے نتیجے میں انگریزوں نے مسلمانوں کو مشق ستم بنانے کے اپنے رویے میں نرمی لائی اور اصل حل کی طرف توجہ دی اور ہوا بھی یہی کہ ایک عرصہ بعد مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور سماجی حالت میں بہتری آئی یہ صرف اور صرف سرسید احمد خان کی محنت کا نتیجہ

تھا۔سرسید نے بڑی حکمت اور ذہانت کا مظاہرہ کیا اور یہ سوچا کہ ابھی برطانوی حکمرانوں کی نظر میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے یعنی مسلمان ان کی نظر میں غدار ہیں ان پر اعتماد کرنا ممکن نہیں ہے ایسے میں انھوں نے یہ سوچا کہ پہلے میں خود اپنے آپ کو اچھا بنا کر برطانوی سامراج کے سامنے پیش کرتا ہوں جب وہ مجھ پر اعتماد کرلیں گے تب اس کے بعد دھیرے دھیرے اپنی تصویر میں مسلمانوں کی تصویر کو ڈھال دیا جائے گا اور سرسید نے کیا بھی ایسا ہی۔سرسید نے اپنی اس نجی پالیسی کے تحت سب سے پہلے ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور پھر ۱۸۶۸ء میں چھوٹے مقدمات کے لیے جج مقرر کیے گئے۔پھر ہوا یہ کہ ۱۸۷۶ء میں وہ نوکری سے مستعفی ہوگئے۔مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔برطانوی حکمرانوں کی نظر میں سرسید کی تصویر ایسٹ انڈیا کمپنی سے وفاداری کے نتیجے میں اچھی تھی لہٰذا سلطنت برطانیہ نے سرسید کی خوب خوب ستائش کی۔اب جب سرسید نے یہ دیکھا کہ میری تصویر بحیثیت مسلمان اچھی ہوگئی ہے اور بغاوت کا دور بھی ختم ہو چکا ہے تب انھوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں ہندوستان کی رعایا بالخصوص مسلمانوں کو ایک اچھا، سچا اور ایماندار کی صورت میں پیش کیا اور یہ پوری کوشش کی کہ مسلمانوں پر لگے بغاوت کے الزامات دھل جائیں اور مسلمان اس سے بری ہوجائیں۔اس رسالہ کا فائدہ سلطنت برطانیہ کو ہوا جس نے اس کی بنیاد پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے برصغیر کا تمام قبضہ لے لیا اور ہندوستان کو ان کے مستقبل کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے سرسید نے مغربی طرز کی سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جدید اسکولوں اور جرائد و رسائل کا اجرا کیا۔چوں کہ سرسید کا مشن تھا مسلمانوں کو روشن خیال بنانا اور انھیں جدید تعلیم سے آراستہ کرنا لہٰذا انھوں نے اس کی پہلی بنیاد ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں گلشن اسکول کو قائم کر کے رکھی۔پھر ۱۸۶۳ء میں وہ غازی پور گئے اور وہاں جا کر ایک اسکول وکٹوریہ اسکول کے نام سے قائم کی اور پھر ۱۸۶۴ء میں محض ایک سال کے وقفہ کے بعد غازی پور میں سائنس سوسائٹی برائے مسلمانان ہند قائم کی جو کہ اپنے اعتبار کا اہم کام تھا۔

اس کے بعد محسنِ قوم وملت نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر جنوبی ایشیا میں مسلم یونیورسٹی بنا۔سرسید کے یہ وہ کام ہیں جسے صبح قیامت تک نہیں بھلایا جاسکتا ہے۔سرسید نے بارہا اپنے کردار، اعمال وافعال اور کارکردگی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان برطانوی حکمرانوں کے دشمن نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے وفادار ہیں۔اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی کہ اردو بطور زبان رابطہ عامہ کی زبان بنے اور مسلمان اس کو اپنی زبان بنائیں۔جس کے نتیجے میں جدید اردو کی بنیاد پڑی اور ایک تحریک علی گڑھ تحریک بھی وجود میں آئی۔دراصل ان تمام تحریکات کے پیچھے سرسید کی فکر اور ان کی روشن دماغی ہی کارفرما تھی۔انھوں نے ایسے وقت میں مسلمانوں کو سہارا دیا جس وقت مسلمان ہر اعتبار سے دبائے

ISSN : 2582 - 3612

جارہے تھے اور ان کو ہر اعتبار سے کچلنے کی سازش رچی جارہی تھی۔مسلمان ایک طرح سے مشقِ ستم بنے ہوئے تھے۔گویا کہ مسلم دشمنی اپنے شباب پر تھی اور خدا کے علاوہ مسلمانوں کا نہ کوئی سیاسی لیڈر سامنے تھا، نہ کوئی سماجی مصلح ان کے لیے فکرمند تھا اور نہ کوئی تعلیم کے میدان میں ان کی رہنمائی کرنے والا تھا۔مسلمان بالکل بے سہارا اور بے یارومددگار تھے۔پوری حکومت دشمن تھی اور ساری دنیا تماشہ بیں بنی ہوئی تھی کسی کو کوئی فکر نہیں تھی ایسے میں سرسید اپنی قوم کے لیے روشن تارا بن کر نمودار ہوئے۔اس سے قبل انھوں نے بڑی ہی مصلحت اور ذہانت کے ساتھ برطانوی حکمرانوں سے اپنے تعلقات استوار کیے۔ان کو یقین دلایا اور اعتماد میں لیا اس کے بعد انھیں اس کام سے روکا جو وہ مسلمانوں کے خلاف آنکھ بند کر کے کررہے تھے جس کی وجہ سے چہار جانب خون مسلم ناحق بہایا جارہا تھا۔سرسید احمد خان نے وہ کام کردکھایا جو لوگ صدیوں تک نہیں کرپاتے ہیں مگر انھوں نے چشمِ زدن میں اللہ کی مدد سے تاقیامت باقی رہنے والا کام کردکھایا۔پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے حالات سدھرے، مسلمان تعلیم کے میدان میں آگے آئے، مسلمان روزگار میں آگے آئے اور پھر ملک کی دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل ہوئے۔پھر سرسید جب ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۶ء تک فتح پور سیکری میں سرکاری خدمات سرانجام دیتے ہوئے، محنت وایمانداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ۱۸۴۶ء میں دہلی میں صدرامین مقرر ہوئے۔اس کے بعد قیام دہلی کے دوران انھوں نے ایک تاریخی کام کیا وہ کام یہ تھا کہ ۱۸۴۷ء میں ''آثارالصنادید'' کتاب لکھی جو کہ سرسید کی معرکتہ الآرا کتاب ہے۔سرسید نے رفاہی اور تعلیمی کام کرتے ہوئے علمی کام بھی انجام دیا تاکہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے قریب رکھا جائے انھیں ان کی تاریخ کو یاد دلایا جائے پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ اس علمی کام کے ذریعہ سے مستقبل قریب میں تاریخ کو مسخ کرنے سے بچایا جاسکے گا اور ہوا بھی یہی اور اب تک مسلسل یہ کوشش ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مٹادیا جائے۔مگر یہ اتنی آسانی سے کیسے ہوگا کیوں کہ ہمارے بزرگوں نے اسے خون جگر سے لکھا ہے۔پھر اس کے بعد سرسید کا ۱۸۵۷ء میں بجنور تبادلہ ہوگیا۔آپ بجنور جا کر بھی اپنی علمی حرارت کو کم نہیں ہونے دیا کیوں کہ آپ کے دل میں قوم کا درد تھا اور ہمہ وقت قوم کے لیے فکرمند رہا کرتے تھے۔لہٰذا بجنور میں قیام کے دوران سرسید نے ایک کتاب ''سرکشی بجنور'' لکھی۔چونکہ وہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بجنور میں ہی مقیم تھے۔وہ وقت کافی برا تھا اور خطرناک وقت تھا جس کٹھن وقت میں آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے انگریز عورتوں، بچوں اور ان کے لوگوں کو بچایا تب ان کی جانیں محفوظ رکھ سکیں ورنہ یہ انگریز ماردیے جاتے، چوں کہ سرسید ہمدرد اور رحم دل انسان تھے اس لیے انھوں نے انسانیت کو بچانے اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے کیا تھا۔جب برطانوی حکمرانوں نے سرسید کے اس غیر معمولی کارنامے سے خوش ہوکر جنگ آزادی کے بعد آپ کی خدمت میں ایک جاگیر پیش کی مگر انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کر دیا۔ نتیجتاً انگریز سرسید کی اس خودداری سے بہت حیرت زدہ ہوئے پھر انھوں نے سرسید کو ترقی دے کر ۱۸۵۷ء میں صدر الصدور بنا دیا اور آپ کی تعیناتی مراد آباد کر دی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۶۲ء میں آپ کو پھر تبادلہ کر کے غازی پور بھیج دیا گیا اور پھر ۱۸۶۷ء میں آپ بنارس میں تعینات ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں آپ کو امپیریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ پھر آپ کے جملہ کاموں کے اعتراف میں سر کا خطاب دیا گیا۔ چوں کہ آپ شروع سے ہی ہمت اور وفاداری کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرسید نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہ سب بغیر کسی غرض، نام و نمود اور کسی فائدے کے بغیر کیے تھے بس ایک ہی فکر تھی ملک اور قوم وہ چاہتے تھے کہ ملک نہ ٹوٹے اور ملک کے باشندے ناخواندگی سے باہر نکل کر تعلیم یافتہ ہوں تاکہ ملک اور ملک کی عوام بالخصوص مسلمان تیزی سے ترقی کریں۔ چوں کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا، اس لیے سرسید نے واضح طور پر کہا کہ تم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلو اور یہ بھی کہا کہ بغیر دین داری کے دنیا داری کا حصول ممکن نہیں ہے اس لیے دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم دونوں کو سرسید نے لازمی قرار دیا اس وقت جب وہ بنارس میں مقیم تھے تب ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانِ ہند'' قائم کیا۔ جس کا سکریٹری سرسید کو بنایا گیا۔ اس کمیٹی کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ملک کے درسگاہوں میں جو سرکاری ہیں معلوم کیا جائے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان تعلیم حاصل کرنے سے کتراتے ہیں۔ یا قصداً وہ تعلیم حاصل نہیں کرتے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ اسی ملک میں رہنے والی دوسری قومیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی ہیں مگر مسلمانوں کے بچے اور بچیاں اس تعلیم سے دور کیوں ہیں۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے یہ سروے کر کے معلوم کیا جائے۔ کیوں کہ وہ دور تھا جب مسلمانانِ ہند اپنی قدیم تعلیم سے بھی دور تھے اور جدید تعلیم ان میں رواج نہیں پا رہا تھا اس طور پر مسلمان ہر اعتبار سے بچھڑے جا رہے تھے۔ لہٰذا یہ کوشش کی گئی کہ اس کی اصل وجہ دریافت کی جائے جو کہ محقق ہو اور جب وجہ معلوم ہو جائے تب اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس تعلق سے نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ :

''جس تاریخ کو کمیٹی مذکورہ کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری '' آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زاروقطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں

سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ :

''اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔''

پھر کہنے لگے :

''جو جلسہ کل ہونے والا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اُدھیڑبُن میں گزر گئی ہے کہ دیکھیے، کل کے جلسے کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔''

نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ :

''سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔''

(سرسید کی کہانی سرسید کی زبانی، الطاف حسین حالی ص ۱۸)

مندرجہ بالا پیراگراف کو اگر بغور پڑھا جائے اور اس کے بعد سرسید کے تعلیمی نظریات جو کہ مختلف کتابوں میں درج ہیں اور مختلف مقالہ نگاروں نے لکھے ہیں ان سے موازنہ کیا جائے تب جا کر ہمیں اندازہ ہوگا کہ سرسید کے دینی، سیاسی اور سماجی سارے کام ایک طرف مگر جو وہ قوم کی تعلیم کے لیے سوچتے تھے اور تعلیم کے میدان میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ لائق مستحسن ہیں۔ ان کاموں کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس پیراگراف میں دیکھیے کہ محسن الملک نے جو سرسید کی دلی بے چینی اور ذہنی الجھنوں کا ذکر کیا وہ صرف ایک خادم قوم اور محسن قوم کے اندر ہی ہو سکتی ہے ورنہ اس دنیا میں اپنے علاوہ دوسروں کے لیے کون سوچتا ہے مگر سرسید کی زندگی پیامبرانہ زندگی تھی۔ انھوں نے اپنے منفرد اور بے نظیر قدموں سے نہ صرف اپنی قوم کا دل جیتا ہے بلکہ ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایسی شخصیات روز روز نہیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ سرسید کا جو تعلیمی نظریہ تھا اور انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات کو بروئے کار لا کر تعلیم کے میدان میں جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

سرسید احمد خان کے تعلیمی نظریے کے تعلق سے محمد قمر الدین نانپوری اپنے مضمون ''تعلیم نسواں سرسید کے حوالے سے'' میں یوں رقمطراز ہیں :

''سرسید احمد خاں تعلیم و تربیت کے میدان میں بہت ہی وسیع و جامع تصور رکھتے تھے اور اسے کسی دائرے میں محدود کرنے کے قائل نہ تھے، ان کی نظر میں تعلیم کا

خاص مقصد انفرادی وقومی زندگی کی تعمیر اور معاشرتی وثقافتی ترقی کا حصول تھا۔
یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مختلف مواقع پر بہت ہی صاف لفظوں میں اس
حقیقت کو واشگاف کیا کہ کسی بھی قوم کا تنزل دور کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ
اس قوم میں تعلیم کو فروغ دیا جائے اور اہل قوم کو اس سے مزین کیا جائے۔‘‘

(محمد قمرالدین نانپوری: تعلیم نسواں سرسید کے حوالے سے،تہذیب الاخلاق)

سرسید نے بڑی فکرمندی کے ساتھ زندگی کے بیشتر شعبوں کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔اس مطالعہ کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے تعلیم کا حاصل کرنا بیحد ضروری ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو علوم عصریہ اور علوم دینیہ حاصل کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں، اور یہی چیز اس قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔سرسید نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اس وقت مسلمان خود کو سیاست میں ڈھکیلنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ تعلیم کی طرف مرکوز کریں اور کوشش کریں کہ دوسری ترقی یافتہ اور مہذب قوم کی طرح خود کو کامیابی سے ہم کنار ہوں۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے مسلمانوں میں پائی جانے والے غلط عقائد اور اس کے ذریعہ درآنے والے رسومات اور مذہبی اوہام کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

سرسید احمد خان نے جب جدید تعلیم کا صور پھونکا تب اس وقت یہ اعلان کیا کہ مسلمان اپنے اسلامی اقدار اور مشرقی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید علوم سیکھنے کی طرف راغب ہوں،اس وقت انھیں بہت سی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ان کو نیچری، انگریزوں کا پٹھو اور کافر وغیرہ القاب سے نوازا گیا۔دراصل اس وقت مسلمانوں کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر ان کی قوم انگریزی تعلیم حاصل کرتی ہے تو امید ہے وہ اپنے مذہبی عقائد سے دور ہوجائیں۔ جب کہ یہ غلط سوچ تھی سرسید جدید تعلیمی نظام کے تحت مسلمانوں کو میدان تعلیم میں اٹھانا چاہتے تھے اور مسلمانان ہند کو پستی سے نکال کر باوقار و بلند مرتبہ دلانا چاہتے تھے۔

Md. Naseer Ahmad
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
R. L. S. Y. College
Bettiah (Bihar)
Mob.- 62992 13620

ISSN : 2582 - 3612

محمد مرغوب عالم

علی سردار جعفری کی شعری انفرادیت

علی سردار جعفری انتہائی مُنفرد لب و لہجے اور معتبر مرتبے کے مالک ہیں۔انہوں نے کلاسیکی نظم وضبط اور شائستگی کے ساتھ جدید اسالیب کو بڑی خوبی سے اپناتے ہوئے آج کی تیسری دُنیا کے انسان کی آواز کو اپنی آواز میں سمولیا ہے۔ان کی شاعری اور فکر دونوں نے گزشتہ چالیس برس کے عرصے میں اردو ادب پر نمایاں اثر ڈالا اور آج بھی اردو کے منظرنامے میں نوجوان نسل کے لئے رہنمائی کررہے ہیں۔

ان کی شعری تصانیف کی اِبتدا ان کے شعری مجموعے "پرواز" سے ہوئی۔جس کی سن اشاعت 1944ء ہے۔اور پہلی نظم کا عنوان "بغاوت" ہے۔اس نظم کا آخری شعر ان کی فکر کا ترجمان اور ان کی آئندہ جِست کا سراغ بھی دیتا ہے۔

بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصر حاضر کے سَپوتوں کا ترانہ ہے

سردار جعفری کا شعری مجموعہ "نئی دُنیا کو سلام" جو ایک تمثیلی نظم بھی ہے۔اور 1947ء میں شائع ہوئی اس کی اشاعت سے دنیائے ادب کو ایک نئی جَہت ملی۔یہ تمثیل تین کرداروں پر مُشتمل ہے۔تمثیل کا ہیرو جاوید ہے جو فرنگی سامراج کا دشمن ہے, دوسرا کردار مریم ہے جو جاوید کی شریک حیات ہے تیسرا کردار فرنگی ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کو تہہ وبالا کررہا ہے۔سردار جعفری نے اپنے ملک کی زبوں حالی کے اظہار اور غلامی کے لئے سپاہی کا اِستعارہ کا استعمال کیا ہے۔تو دوسری طرف مریم سے جاوید کی محبت کو روشنی کے اِستعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔اس نظم میں عشقیہ جذبے تقدس کی بلندیوں سے ہم کنار نظر آتے ہیں۔

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھانوں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
خمار نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حِنا کے کنول جلائے ہوئے
کھڑی ہے خواب وفسانے کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے

سردار جعفری کے پیکروں میں زیادہ تر بصارت کا عَمل حاوی ہے مُحوّلہ بالا اشعار میں رات کی پلکوں کی چھانوں پڑنے کا پیکر ہماری حِسّ بصارت کو متحرک کرتا ہے۔"اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہوئے" مصرعے میں سخت خموشی سے ہماری حِسِ لامسہ اور حسِ سامعہ برانگیخت ہوتی ہے۔اس طرح ہتھیلیوں پر جنا کے کنول جیسے پیکر ہماری حسِ بصارت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔سردار کی پیکر آفرینی میں بصارت کا عمل اس لئے بھی حاوی ہے کہ وہ چیزوں کو ہمیشہ ان کے مختلف رابطوں اور رشتوں کے ساتھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے ناطے ان کے پیکروں میں بڑی مانوسیت پائی جاتی ہے۔چوں کہ وضاحت شعر کے جمالیاتی حسن کی نفی کرتی ہے۔اس لئے سردار نے پیکر آفرینی کے ذریعے اپنے اسلوب کو ایک خاص انفرادی رنگ میں ڈھال دیا ہے۔

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو آگے بڑھانے کی ضمن میں سردار جعفری ایک معتبر نام تھا۔وہ ترقی پسندوں کے قافلہ سالار کی حیثیت سے تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ان کی پیش رَو پریم چند کا یہ معنی خیز جملہ کہ "اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ جاگیرداری سماج کے حسن کے محدود تصور کی جگہ حسن کے ایک ایسے ماڈی اور افادی تصور کی ضرورت ہے جو حقیقت کے زیادہ قریب ہو۔

سردار جعفری نے بھی پریم چند کے اسی موقف کی جگہ جگہ ترجمانی کی ہے اور بڑے اعتماد اور رِجائیت کے ساتھ انسان کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھے ہیں وہ مارکسی نقطۂ نظر کے حامل تھے اور سویت روس میں واقع ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے ان پر گہرے اثرات بھی تھے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ

"میرے لئے زمین سے زیادہ حسین انسان سے زیادہ پروقار اور مستقبل سے
زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے"

(بحوالہ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔58,59)

سردار جعفری کی نظر میں انسان ناقابل شکست ہستی ہے ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ فتح منداور کامران رہے گا۔یہ ان کا سب سے بڑا انسپریشن ہے جو ان کی شاعری کا محور ہے۔

سردار جعفری کی شاعری نالہ و بکا، آہ و فریاد نہیں بلکہ تاریکی، افلاس، درندگی اور غلاظت کے خلاف جِد وجہد ہے۔ان کی شاعری میں للکار ہے۔جس میں شاندار مستقبل کی بشارت کے ستارے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اٹھو کے جشن دل و جان منا یا جائے گا   ہر ایک چمن میں یہی گُل کھلایا جائے گا
یہ گُل جو درد محبت ، امانتِ غم ہے   یہ گُل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی
خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

فراق گورکھپوری کا خیال تھا کہ سردار جعفری نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو جتنا فائدہ پہنچایا اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ :

ISSN : 2582 - 3612

"سردار ہنسیار ہتھوڑے کی شاعری کرتے ہیں ان سے محبتوں کی چہکار اور
جمالیات کی شاعری ممکن نہیں"

لیکن اس کے برعکس جب ہم سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں محبتوں کی چہکار کی بہت سی تصویریں ملتی ہیں اور ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ طویل نظم مختلف تصویروں کا آئینہ خانہ ہے۔

اُفق پر کرن خواب سا بن رہی تھی   دو پٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی
ترے روح و دل پہ تھے بادل سے چھائے   کھڑی تھی مرے پاس گردن جھکائے
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا   مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا

سردار جعفری کی شاعری شعلہ و شبنم کی شاعری ہے۔نظم میں ان کی شعلگی کبھی کبھی نثر کا سا آہنگ اختیار کر لیتی ہے۔خِطابت کی وجہ سے لہجہ بلند ہوجاتا ہے یہی انداز جوش ملیح آبادی کی باغیانہ شاعری میں اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے اور اقبال کے یہاں بھی اکثر در آتا ہے۔اس ضمن میں سردار کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نئے اُفق سے نئے قاتلوں کی آمد ہے   چراغ وقت کی رنگین لو بڑھاتے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر   زمیں پہ پانو فلک نظر جمائے ہوئے
اٹھو اور آٹھ کے انہی قافلوں میں مل جاؤ   جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے

یہ اشعار رِجائیت کے اس احساس سے مملو ہیں جو وقتی نہیں دائمی ہیں اس کرب کو ہم اقبال کی شاعری میں بھی پاتے ہیں۔

اُٹھو مِری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخ امرا کی در و دیوار ہلادو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے   کُنجشک فِر و مایہ کو شاہین سے لڑادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہنگامی حالات پر کہے ہوئے اشعار حالات کے تبدیل ہونے پر اپنے معنی کھودیتے ہیں۔ہندوستان کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا اس کے باوجود یہ نظم اپنی بیانیہ قوت اور شاعرانہ ندرت کی وجہ سے ہماری تاریخ آزادی کا ایک حصہ بن گئی ہے جس کی اہمیت آج بھی قائم ہے۔

نظم " نئی دنیا کو سلام" ایک باغیانہ نظم ہے جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت ہے اور ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کے ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کے لیے اکساتی ہے اس "سیاہ دور" سے نپٹنے اور اس سے چھٹکارا پانے کے لئے مردوعورت کو شانہ بشانہ چلنے کی ضرورت ہے۔جس کو سردار جعفری

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

نے تمثیل بنا کر پیش کیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ علی سردار جعفری نے عورت کی کارکردگی اور اس کی حیثیت کو کتنے دلکش انداز میں شعری قالب میں ڈھالنے کی سعی کی ہے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت　　تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں　　ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے　　کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے

سردار کی عورت وہ عورت نہیں ہے جو صرف ایک معشوقہ، ایک ماں، ایک دردمند بہن، ایک جنسِ نازک ہے بلکہ اب وہ مرد کے شانہ بہ شانہ چل سکتی ہے۔ جنگ آزادی کی لڑائی میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی ایک تصویر سردار جعفری نے بڑے دلکش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ عورت کوئی شئے مجہول نہیں ہے، وہ اپنے وجود کے ساتھ انفرادیت بھی رکھتی ہے۔

تبسّم نہیں صرف، تلوار بھی ہے　　وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی　　شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمعِ شبستاں ہے، نورِ سَحَر ہے　　وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے

سردار جعفری نے اس سے بھی بڑھ کر عورت کو ایک "ماں" کے روپ میں پیش کیا ہے جو محبت، اُنس، شفقت، دردمندی اور بے لوثی کا ایک لازوال پیکر بھی ہے اور تخلیقِ انسانیت کا ایک مستقل سرچشمہ بھی ان سطحوں پر مرد اس کا مقابلہ کر نہیں سکتا ان کی نظموں میں عورت پیر کی جوتی سے اوپر اٹھ کر حرم سرا کے رنگین شبستانوں سے گزرتی ہوئی صدیوں کے ہزیمت زدہ تجربات کو اپنی گرہ میں باندھ کر باہر نکلتی ہے اور مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ سردار جعفری نے عورت کو جس طرح پیش کیا ہے وہ ہماری تہذیب اور تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے　　فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے　　جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ　　وہ آغوش تہذیب کا گاہوارہ

آزاد نظم جو میراجیؔ اور راشدؔ کے یہاں زیر لبی اور کم آمیزی کا نمونہ تھی، سردار جعفری نے اس صنف کو خوش گفتاری کا حامل بنایا۔ سردار جعفری نے آزاد نظم میں غریبوں، مظلوموں اور غلاموں کے دل کی دھڑکنیں اور جوش آزادی کی چنگاریاں سمو کر اسے ایک رواں اور بلند آہنگ عطا کیا، سردار کے آزاد نظم کے تجربے میں وسیع تر موضوعات و مسائل کو شعری پیرائے میں سمیٹنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ سردار نے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ غیر شاعرانہ مفاہیم کو شاعرانہ رنگ و آہنگ عطا کر دیا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

آسماں ناچتا ہے زمیں گھومتی ہے
کھیت کٹتے ہیں کھلیان کٹتے ہیں، پھر چکیاں گاتی ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں
کتنے ہی ہاتھوں میں لاکھ کی چوڑیاں گنگناتی ہیں۔
اس طرح گیہوں کے چاند سورج گاؤں میں، شہر میں، ہر جگہ جگمگاتے ہوئے،
چولھوں پر ناچتے ہیں
روٹیاں کھڑی درمیاں
سرخ سونے کے تراشے ہوئے گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کی مانند گرم
روٹیاں شاخِ طوبیٰ پہ پھلتی نہیں۔

اس نظم کے متعلق معین احسن جذبیؔ کی درج ذیل رائے ملاحظہ فرمائیں، جس میں انتہا پسندی اور جانبداری کا پہلو روشن ہے جسے معروضیت سے عاری کہنا درست ہوگا۔

"میں اسے (سردار جعفری) کو شاعر مانتا ہی نہیں، وہ ایک اچھا نثر نگار ہو سکتا ہے لیکن اچھا شاعر نہیں۔ نہ تو وہ فطری شاعر ہے اور نہ ہی اس کے یہاں کوئی شعریت ہے۔ میں نے اپنے کئی انٹرویوز میں یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طرح نظم کرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ میں اسے شاعر نہیں مانتا۔"

اسی طرح بعض نکتہ چینیوں نے بھی اقبالؔ کو شاعر ماننے سے انکار کیا تھا۔ خود سردار جعفری نے بھی اپنی شدّت پسندی اور انتہا پسندی کے زمانے میں کئی معتبر شعرا کو ملعون و معطون کیا تھا اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ بالخصوص فیض احمد فیضؔ کے بارے میں ان کی رائے بہت واضح ہے۔ سردار جعفری کے سیاسی نظریے سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ خوبصورت الفاظ، دلکش تراکیب نازک پیکر حسین استعارے، رواں دواں زبان اور الفاظ کا فنکارانہ انتخاب سردار جعفری کی بہت بڑی خوبی ہے۔ سردار نے بعض بہترین نظموں سے اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کیا اور بعض قابل قدر تجربے بھی کیے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ان کے شعری مجموعہ "پرواز" کے مقدمے پر تحریر کرتے ہیں :

"اگر علی سردار اپنی شاعری میں کچھ جامعیت اور گہرائی پیدا کر لیں، اگر وہ زندگی کی کلّی حقیقتوں کو اپنے اشعار میں زیادہ جگہ دینے لگیں، اگر ان کی فکر و بصیرت

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

زیادہ رسا اور ہمہ گیر ہو سکے، اگر وہ اپنے لہجہ اور اسلوب میں اس سے بھی زیادہ
نرمی اور گداختگی پیدا کر سکیں جس کی آگے چل کر ہم ان سے قطعی امید کرتے ہیں
تو وہ اردو شاعری میں ایسی جگہ لے سکتے ہیں جو ابھی خالی ہے۔"

(بحوالہ "پرواز" ص۔16)

الغرض سردار جعفری کی شاعری میں گونا گوں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں جب ہم ان کی نظم "نئی دنیا کو سلام، نیند، اودھ کی خاک حسیں، پتھر کی دیوار، میرا سفر، ایشیا جاگ اٹھا، ایک خواب پیراہنِ سرور، اور لہو پکارتا ہے، کو پڑھتے ہیں تو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جن سے ان کی فکر اور فنی ارتقا کا بحسن وخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے میر انیسؔ، جوشؔ اور اقبالؔ کی بلند آہنگ شاعری سے متاثر ہونے والا شاعر جب اپنا لہجہ پاتا ہے تو اس کی شاعری کے ڈانڈے اردو کی سہل ممتنع شاعری سے مل جاتے ہیں اور سردار وہ مقام پالیتے ہیں جہاں شعر ایک دلآویز نثری آہنگ اختیار کر لیتا ہے۔

علی سردار جعفری جتنے بڑے شاعر تھے شاید اس سے بڑے نثر نگار جتنے بڑے مفکر تھے اتنے ہی بڑے مقرر، غرض کہ ایک بڑی شخصیت کے جو بڑے عناصر ہوا کرتے ہیں وہ سب کے سب ان کے باطن میں بڑے سلیقے سے ترتیب پاگئے تھے۔ اس پر گہرا مطالعہ اور مطالعے کی کثیر الجہتی، ادب، جمالیات، اشتراکیت، تصوف، تاریخ، تہذیب، صحافت، ثقافت، سیاست نے مل کر ان کو ایک بڑا اسکالر بنا دیا تھا۔

آخر میں پروفیسر محمد حسن کی اس رائے پر اپنی بات ختم کرتا ہوں :

"سردار کی شاعری بیدار ذہن اور بیدار احساس کی شاعری ہے جو نئی کیفیات
کے امکان سے معمور ہے۔''

Md. Marghoob Alam
Assistant Professor
Deptt. of Urdu
R. K. College, Madhubani
Bihar
Mob. -7463010549

بدر محمدی

اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل پروفیسر نجم الہدیٰ کی نظر میں

اردو ایسی زبان ہے جس کی دھوم بقول داغؔ دہلوی سارے جہاں میں ہے۔ یہ وہ دوشیزہ ہے جس کے عاشق ہزاروں ہیں مگر شوہر کوئی نہیں۔ اس ہر دلعزیز زبان کی سب سے بڑی بدنصیبی بعدِ آزادی سرکاری زبان بننے سے محروم ہو جانا ہے۔ یہ میٹھی اور آسان زبان کڑوی مشکلات سے دوچار رہی ہے۔ چنانچہ معاملات اردو کے متعلق لکھنا اہلیان اردو کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ مسائل اردو پر خامہ فرسائی کا کام بہت سارے قلم کاروں نے انجام دیا ہے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ وہ جہاں دیدہ، باخبر، حساس، خلیق اور انسان دوست شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو تعلیم اور اس تعلیم سے وابستہ روزگار پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس سلسلے میں ان کی باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں مگر ایک مفصل اور مدلل مضمون بعنوان اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل شامل کتاب ہے۔ نصف درجن کتابوں کے مصنف ڈاکٹر نجم الہدیٰ ہر طرح کی تحریروں کی قدر و قیمت پہچاننے کا نہ صرف حوصلہ اور شوق رکھتے ہیں بلکہ اس کی صلاحیت اور بصیرت بھی ان کے پاس ہے۔ انہیں ہر طرح کا مضمون قلم بند کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ اس کا بین ثبوت ہے مقالہ ''اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل'' موصوف کا یہ مضمون ان کی کتاب ''مسائل اور مباحث'' میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مضامین خاص خاص مواقع اور تقریبات کی یادگار ہیں۔ اور ان میں ان کے برسوں کے مطالعہ اور محنت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ کتاب ''مسائل ومباحث'' کے بارے میں معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی ''تاریخ ادب اردو'' میں یوں رقم طراز ہیں :

''مسائل و مباحث موصوف کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں غالب
اقبال اور انیس کی بعض جہتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو تنقید کے جدید
میلانات سے ایک اچھی گفتگو ملتی ہے۔ تقابلی تحقیق کے مسائل کو سمجھنے کی سعی
کی گئی ہے۔ نیز تحقیقی مقالے کی ہیئت اور اسلوب کی افہام و تفہیم کی طرف
توجہ ملتی ہے۔''

الغرض پروفیسر نجم الہدیٰ کی متنوع مزاجی کا حصہ مضمون اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل لائق مطالعہ ہے۔کتاب کردار اور کردار نگاری کی طرح اسے انگریزی کی چودہ اہم ترین کتابوں کے مطالعہ کے بعد نہیں لکھا گیا بلکہ جو کچھ انہوں نے دیکھا سمجھا اور محسوس کیا اسے احاطۂ تحریر میں لایا ہے۔اس مضمون کی باتیں ناقدانہ افکار ہیں اور نہ شاعرانہ خیال بلکہ وہ حقیقتیں ہیں جن کا انہوں نے براہ راست سامنا کیا ہے۔ 1958 میں حصول تعلیم سے فراغت پانے کے بعد انہیں روزگار فراہمی کے سخت مرحلے سے گذرنا پڑا۔ برائے ملازمت جو انٹرویوز انہوں نے دیئے ان کی تعداد چار درجن کے قریب ہے۔اسی درمیان غیر تدریسی کام کے طور پر پندرہ روزہ قومی تنظیم ,دربھنگہ کی ادارت بھی فرمائی لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا اور اپنے محبوب مشغلہ لکچررشپ کے لئے کوشاں رہے۔انہیں کامیابی تب ملی جب وہ فارسی سے منسلک ہوئے۔ملت کالج، دربھنگہ میں انہیں لکچرر کی ملازمت فارسی میں ایم۔اے۔کرنے کے بعد حاصل ہوئی۔ بھاگلپور ضلع اسکول سے میٹرک کرنے کے دوران وہ اردو کے اسیر زلف ہوئے۔آئی۔اے سے انہوں نے اس زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔آج بھی وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اردو سے عقیدت ومحبت رکھتے ہیں اور اردو دشمن افراد کے تئیں وہ اپنی مخالفت کا اظہار کرتے ہیں ۔ جہاں تک عملی اقدام کی بات ہے ۔ وہ بہار یونیورسٹی, مظفرپور اور مدراس یونیورسٹی, مدراس میں صدر شعبۂ اردو رہے اور کئی نسلوں کی آبیاری کی۔انجمن ترقی اردو تمل ناڈو کے عہدۂ صدارت پر بھی وہ فائز ہوئے اور اس دوران نصابی کتاب اردو میں تیار کرانے اور اردو میڈیم اسکول کے پھیلاؤ میں حصہ لیا۔اردو کے متعدد ورک شاپ میں شرکت فرمائی۔ پچاس سے زائد سیمینار اور سمپوزیم میں شامل ہوکر انہیں کامیاب بنایا۔

اردو تعلیم سے وابستہ روزگار کا مسئلہ پروفیسر نجم الہدیٰ کے نزدیک اہم ہے۔انہیں اپنی پریشانیوں کی ترجمانی کا شوق نہیں بلکہ اس میدان کے دوسرے افراد کے مسائل سے بھی سروکار ہے۔اس لئے انہوں نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا اور ایک مکمل و جامع مضمون تحریر کر ڈالا۔اس مضمون کا تمہیدی بیان بھی خاصا اہم ہے۔انہوں نے مضمون کا آغاز تعلیم کے آغاز و مقاصد سے کیا ہے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ نے کسب علم کے دو مقاصد بتائے ہیں۔ذوق کی تکمیل اور معاش کا سنگ بنیاد فراہم کرانا۔انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ معاش کی فراہمی ہی بیشتر حصول تعلیم کا محرک ہے۔موصوف نے مزید یہ تحریر کیا ہے کہ علم میں اختصاص کبھی ذوق کی بنا پر نشوونما پاتا ہے اور کبھی فکر معیشت کے نتیجے میں سامنے آجاتا ہے۔ان کے پیش نظر معاش کے مسائل سنگین اور غور طلب ہیں اور اس کے اسباب ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی، سمٹتی ہوئی دنیا، مادیات پر انسان کا بڑھتا ہوا تصرف، مفادات کا تصادم اور اغراض کی پرستش۔

پروفیسر نجم الہدیٰ کا ماننا ہے کہ معاش کو سلجھانے کے لئے تعلیم کی سہولیات میں اضافہ کیا گیا مگر

اس اضافے نے معاش کے مسئلے کو اور سنگین بنا دیا۔انہوں نے معاش کے مسئلے کو تعلیم وتدریس کی سطح پر حل کیئے جانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ان کی نگاہ میں بڑھتی بے روزگاری کے مدنظر حکومت بھی روزگار پر مبنی تعلیم کی تجویز پر عمل پیرا ہے۔معیشت آفریں تعلیم کے تحت عمومی تعلیم کے بجائے تکنیکی تعلیم یا ایسی تعلیم دی جانے پر زور دیا جا رہا ہے جو بنیادی طور پر موجودہ اقتصادی ڈھانچے سے مطابقت رکھنے کی بنا پر روزگار کے حصول کا براہ راست ذریعہ بن جائے۔مروجہ تعلیم کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

مسائل اردو کے نباض پروفیسر نجم الہدیٰ نے تعلیم میں زبانوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظر میں زبان کو تکنیکی تعلیم کا صرف میڈیم سمجھنا مناسب نہیں۔وہ لکھتے ہیں :

> ''ہم اب تک اپنی زبان کے میڈیم سے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی اہمیت پر توجہ نہیں دے سکے ہیں۔ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل سائنسی یا تکنیکی معلومات چاہے جس میڈیم سے ہو حاصل کرے۔حالانکہ ایسی تعلیم جو تعلیم حاصل کرنے والوں کی اپنی زبان میں ہوگی، ان کی اقتصادی غایت کے واسطے سے ان کا مقصود و مدعا بن کر اور ان کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ ہو کر ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائے گی۔اور یہ تعلیم جیسی ٹھوس اور پائیدار ہوسکتی ہے، اس کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔''

روزگار پر مبنی تعلیم میں زبانوں کے کردار کو زیر بحث لاتے ہوئے پروفیسر نجم الہدیٰ نے بتایا ہے کہ اس گفتگو کے دو پہلو ہیں نصابی اور لسانی۔نصابی پہلو یہ ہے کہ روزگار پر مبنی تعلیم پانے والوں کا نصاب ان کی اپنی زبان کے میڈیم سے کچھ ایسے سانچوں میں ڈھالا جائے جو عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوئے معیشت کے مواقع فراہم کریں۔اور لسانی پہلو یہ ہے کہ ایسی تعلیمات میں میڈیم کے فرائض انجام دینے والی زبان کی وسعت، محدودیت اور امکانات کا لسانی جائزہ علوم وفنون سے ہم آہنگ کر دینے کے اعتبار سے لیا جائے۔

جناب نجم الہدیٰ نے تکنیکی تعلیم کے لئے زبانوں کا اس قدر ترقی یافتہ ہونا ضروری ٹھہرایا ہے کہ اس میں مخصوص اصطلاحوں کی گنجائش اور تمام علمی باتوں کو سمیٹنے کی استعداد ہو اور انہوں نے اس معاملے میں زبان اردو کے سلسلے میں اتفاق رائے اور اطمینان کامل کا فقدان بتایا ہے۔ہاں انہوں نے جامعہ عثمانیہ اور ترقی اردو بورڈ، دہلی کی اصطلاح سازی کی سمت میں کی گئی کوششوں اور تالیف وترجمہ سے وابستہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔طبعی اور عمرانی علوم سے متعلق کتابوں کی اشاعت کو بھی سراہا ہے۔اصطلاح سازی کے سلسلے میں ان کا مشورہ نئے ادارے قائم کرنے یا پھر قائم شدہ اداروں کی کوششوں کے نتائج کو معیاری اور مستند بنانے

کی سبیل نکالنے کا ہے تاکہ اصطلاحوں کے استعمال میں پایا جانے والا فرق مٹایا جاسکے اور معیاری اصطلاحوں کا رواج عام ہو۔

زیر بحث مضمون کا اصل پہلو اردو ذریعۂ تعلیم سے تکنیکی مہارت حاصل کرنے والوں کے مستقبل کا ہے۔ اردو کا زمانۂ حال جیسا ہے، ماضی ایسا نہیں تھا اور پھر مستقبل کے کچھ اور ہونے کا اندیشہ ہے۔ علم طبعیات و کیمیا، علم نباتات و حیوانات، علم طبقات الارض و جغرافیہ، علم تاریخ و بشریات، عمرانیات و نفسیات کی تعلیم میں علاقائی اور ثانوی سرکاری زبانوں کا جو دخل ہوسکتا ہے اس کے نقطۂ نظر سے اردو کی حیثیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے اس قابل بنانا ہے کہ یہ قومی ترقی معیشت اور بہبود کے کاموں میں اپنا رول ادا کر سکے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ نے تالیف و ترجمہ کو اردو کی اعلیٰ تعلیم کے شعبوں اور شاخوں کے طور پر مختلف یونیورسٹیوں میں متعارف کرانے کی ضرورت بتائی ہے، اسے ثانوی سرکاری زبان بنا دینا کافی نہیں ہے۔ دفتری کاموں میں اردو کے استعمال پر توجہ دینا لازمی ہے۔ جو لوگ اردو کی روٹی کھا رہے ہیں وہ اردو کا کام بھی کریں۔ کچھ ایسے ملازم بھی ہیں جو اردو کے کام پر مامور کئے گئے ہیں مگر وہ عام ملازم کی طرح مصروف کار ہیں۔ اردو سماج کو بھی چاہئے کہ اردو کے کام پر مامور ملازموں کو سرگرم عمل رہنے کا بندوبست کریں۔

مضمون نگار پروفیسر نجم الہدیٰ نے یہ مقالہ 1975 میں بنگلور میں منعقد انجمن اساتذۂ اردو کی کانفرنس میں پڑھا تھا۔ جس میں ہندوستان بھر کے لوگوں نے شرکت کی تھی۔ نتیجتاً پروفیسر موصوف کے ذریعہ اٹھائے گئے سوالات اور مشورے دور دور تک پہنچے۔ ان کے خیالات کی اس وقت اور بھی تشہیر ہوئی جب 1976 میں ڈاکٹر آمنہ خاتون کی ادارت میں شائع ہونے والے شعبۂ اردو, بنگلور یونیورسٹی کے مجلّہ اوراق بصیرت افروز کی جلد دوم میں مذکوہ مقالہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس مقالے کی تجاویز نے مسائل اردو کی صورت حال میں بہتری لانے کا کام کیا۔ گمان غالب ہے کہ کتابوں کی اردو میں اشاعت اور تمل ناڈو اردو اکیڈمی کا قیام نجم الہدیٰ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ملک کے مختلف شہروں میں مرکزی ترقی اردو بورڈ اور مختلف ریاستی اردو اکیڈمیوں کے تعاون سے قایم ہو رہے کتابت کے مراکز کو پروفیسر نجم الہدیٰ نے خوش آیند واقعہ بتایا ہے۔ انہوں نے خوش نویسی اور خطاطی کے ادارے قایم کرنے اور ان کے فنون میں کمال حاصل کرنے والوں کے مستقبل کا حل ڈھونڈنے پر توجہ مرکوز کرائی ہے۔ نجم الہدیٰ صاحب نے اردو ٹائپ رائیٹنگ سے فن کتابت کے فروغ کے جو امکانات واضح کئے ہیں انہیں اب کمپوزنگ کے تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ اردو رسم الخط سے روزگار تب بھی منسلک تھا اور اب بھی ہے۔ ہاں تب کتابت کا مسئلہ تھا اور اب کمپوزنگ کا معاملہ ہے۔ لہٰذا نجم الہدیٰ صاحب کی یہ تجویز کارآمد ہے کہ انجمن ترقی اردو اور اس طرح کے ادارے توجہ کریں تو اردو تعلیم کی رسم الخط سے فنی تعلق رکھنے والوں کے بھی روزگار کے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر نجم الہدیٰ نے اولاً میدان عمل اور جولان گاہ فراہم کرنے پر زور دیا ہے۔ پھر نصاب بنانے یا علوم کا سنگ بنیاد ڈالنے کی بات کہی ہے۔ ان کے مطابق اردو تعلیم کو اگر روزگار کے مسائل کے لئے مفید بنانا ہے تو ماحول کے موجودہ حصاروں اور دائروں کو وسیع کرنا ہوگا۔ اور اپنے نصاب میں بھی وسعت اور لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اہل علم حضرات سے سر جوڑ کر بیٹھنے کی گذارش کی ہے اور اردو کے جدید تکنیکی نصاب تیار کرنے اور معیشت آفریں اردو تعلیم کے ڈھانچے کا جائزہ لینے میں اپنی فنی مہارت اور علمی اختصاص کے ساتھ بھرپور علمی تعاون کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اپنے مقالے میں پروفیسر نجم الہدیٰ نے معیشت آفریں تعلیم کی وکالت کی ہے مگر عمومی تعلیم کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم اگر ذوق کے تحت ہو تو وہ ادھوری تعلیم ہے۔ اور برائے معاش ہو تو اسے تکمیل کے مرحلے میں کہا جاسکتا ہے۔ مقالہ اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل کا ایک ایک لفظ معنی خیز ہے۔ لہٰذا یہ بغور جستہ جستہ پڑھے جانے کا متقاضی ہے۔ اس کا ہر جملہ غزل کے مصرعے کی طرح پر معنی اور تشریح طلب ہے۔ یہ مضمون بلاشبہہ معلوماتی، مدلل، موثر، واضح، منطقی اور تشفی بخش ہے لیکن اس کا اختتامیہ مبہم قسم کا ہے جو اس طرح ہے :

> ''ہم جس دنیا میں سانس لیتے ہیں اس کا نظام معیشت ہی کچھ ایسا ہے کہ
> اقتصادیات سے خالص تخلیقی عوامل کا بھی ربط پنہاں ڈھونڈ نکالا جاسکتا ہے۔
> اور موضوع کا تقاضا یہ ہے کہ گفتگو کے اس رخ کو میں ہاتھ نہ لگاؤں۔''

مضمون کا یہ حصہ تخلیقی ادب کو معاش کا ذریعہ بنانے سے متعلق ہے، پروفیسر نجم الہدیٰ نے اس سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے اس لئے اس کی وضاحت نہیں ہو پائی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ شعر و ادب کی تعلیم اور اس میں دستگاہ اور اختصاص کو اس طرح روزگار سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا جس طرح زبان و ادب کے دوسرے اور معیار کے اعتبار سے ثانوی شعبوں اور شاخوں کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اصلاح سخن بھی کتنوں کے روزگار کا حصہ ہے۔ اور شعر و سخن سے بھی لوگ حصول زر میں مصروف ہیں۔ مشاعرہ تو آج باضابطہ انڈسٹری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ رسائل و جرائد کی اشاعت اور اس میں گوشے کی شمولیت روزگار سے وابستگی کا بین ثبوت ہے۔

کتاب مسائل و مباحث کے دوسرے مضامین کی طرح اس مقالے میں بھی کوتاہیاں اور فروگذاشتیں ہیں۔ مگر مجموعی طور پر یہ مقالہ پروفیسر نجم الہدیٰ کے ہمدرد اردو اور مستقبل شناس ہونے پر دال ہے۔ اس مضمون کی باتیں ایسی قطعی نہیں کہ وہ خود لکھیں اور خود ہی پڑھیں۔ اس مقالے میں اردو طلباء کو درپیش مسائل کا ذکر ہے، زبان اردو سے متعلق اندیشے کا اظہار اور پھر مفید مشورے بھی ہیں۔ پانچ دہائی قبل

اردو تعلیم کے جو مسائل تھے وہ آج بھی ہیں۔ روزگار کے مسائل اردو سے نسبتاً زیادہ منسلک ہیں۔ اردو رہنماؤں کی بے اعتنائی اور عوامی حلقوں کی سرد مہری سے مسائل میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر ہم نے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس لئے نجم الہدیٰ صاحب کے مذکورہ مضمون کی معنویت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ 1983 میں اس کی معنویت ان کے پیش نظر تھی۔ 1975 میں یہ مقالہ تحریر کرنے کے بعد درمیان کے آٹھ سالوں میں اردو تعلیم سے منسوب روزگار کے بعض مسائل حل ہوئے تاہم انہوں نے اس مضمون کو شامل کتاب کرنا ضروری سمجھا۔ اور آج 46 سالوں کے بعد بھی اس کی معنویت برقرار ہے۔ اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل ایسا مضمون ہے کہ اردو دنیا کا ہر پڑھا لکھا شخص نجم الہدیٰ کی باتوں کا اعتراف کرے گا۔ پروفیسر نجم الہدیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اردو کی پڑھائی بھی دوسری زبانوں کی طرح تندہی سے ہو۔ اردو والے تمام سبجکٹ کو پڑھیں اور اردو میں پڑھیں۔ اردو پڑھ کر وہ ناکام نہیں کامیاب ہوں، برسرروزگار ہوں اور روزگار میں آنے پر وہ اپنا کام اردو ہی میں کریں۔ مزہ تو جب ہے کہ ہم اپنے بچوں کو خود بھی اردو پڑھائیں یہ کام صرف معلم کے ذمے نہیں چھوڑیں۔ یہ باتیں پروفیسر نجم الہدیٰ کے اردو کا سچا بہی خواہ ہونے کی غماز ہیں۔ اردو جیسی زندہ زبان کے مسائل کا دیانت دارانہ تذکرہ کر کے پروفیسر نجم الہدیٰ نے زندہ دل ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ خدا کرے کہ ان کی یہ زندہ دلی یونہی قایم دائم رہے۔

Badr Mohammadi
At - Chandpur Fatah
P.O. - Bariarpur
Distt - Vaishali (Bihar)
Mob.- 9939311612

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن

گوپی چند نارنگ کا تنقیدی شعور

اردو زبان وادب کے میدان میں گوپی چند نارنگ کا نام سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ نے شعروادب کے مختلف جہات کو اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی ادبی خدمات یا یوں کہیں کہ تنقیدی شعور کا جائزہ آپ کی تصنیفی خدمات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کی تصانیف اس طرح ہیں۔

''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' (۲۰۰۲ء-۱۹۶۱ء-۱۹۵۹ء) ''کرخنداری اردو کا لسانیاتی مطالعہ'' (انگریزی) (۱۹۶۱ء) ''اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' (۱۹۶۱ء-۱۹۶۹ء) ''پرانوں کی کہانیاں'' (۱۹۷۶ء) ''اسلوبیات میر'' (۱۹۸۵ء) ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ'' (۱۹۸۶ء) ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' (۱۹۸۹ء) ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب'' (۲۰۰۲ء) ''ساختیات پس ساختیات او رمشرقی شعریات'' (۱۹۹۳ء-۲۰۰۵ء) ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' (۲۰۰۴ء) ''امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اسپرنگ'' (۱۹۹۲ء-۱۹۱ء-۱۹۸۷ء) ''جدیدیت کے بعد جدیدیت'' (۲۰۰۴ء) ''اردو زبان اور لسانیات'' (۲۰۰۶ء)۔ اس فہرست میں دو کتابیں نہیں ہیں جنہیں موصوف نے بڑی جدت اور جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ایسی چند کتابوں کے نام ہیں۔ ''ارمغان مالک'' (جلد اول ودوم) (۱۹۷۲ء) ''اقبال جامعہ کے مصنّفین کی نظر میں'' (۱۹۷۹ء) ''اردو افسانہ: روایت اور مسائل'' (۱۹۸۲ء) ''انتظار حسین کے افسانے''، ''مابعد جدیدیت اور مکالمہ''، ''اطلاقی تنقید اور نئے تناظر''، ''املا نامہ''، ''ہندوستان کے اردو مصنّفین اور شعرا'' (بہ اشتراک عبداللطیف اعظمی) ان کے علاوہ انہوں نے ایک سفرنامہ ''سفر آشنا'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ انگریزی اور ہندی میں بھی ان کی پندرہ سترہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام کتابوں کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تنقید وتحقیق پر مبنی ان کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ یہ تمام کتابیں معرکہ آرا ہیں جن کی اہمیت رفتہ رفتہ بڑھتی ہی جائے گی۔ مثال کے طور پر آپ کی کتاب اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، میں نارنگ نے غزل کی نشوونما اور ارتقا کا حال روشن کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی تنقیدی کتاب ہے۔ جس میں ہندوستانی ذہن وتہذیب کے حوالے سے

اردو غزل کی مکمل تفہیم کے عمل کو سامنے لایا گیا ہے۔اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ گوپی چند نارنگ کو اساطیر پر پوری گرفت حاصل ہے۔ کتاب ''نیا اردو افسانہ: تجزیے اور مباحث''، ''اردو افسانہ: روایت اور مسائل''، ''اطلاقی تنقید: نئے تناظر'' اور ''اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ'' وغیرہ کتابیں ہیں جن کو تنقید کے میدان میں اضافے کی حیثیت حاصل ہے۔مختصر یہ کہ گوپی چند نارنگ کی اردو تنقید میں جو حیثیت ہے اس کا مکمل تجزیہ مشکل ہے۔آپ کا تنقیدی شعور کتنا اہمیت کا حامل ہے اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''اردو دنیا میں پروفیسر نارنگ ایک ایسی دلآویز، ہمہ جہت، پروقار اور پرکشش شخصیت ہیں کہ جنہوں نے عالمی سطح پر اردو کے فروغ اور اس کی بقا کے لئے پورے جوش و جذبے کے ساتھ کام کیا ہے۔اسے اردو کی خوش نصیبی ہی سمجھئے کہ اسے نارنگ جیسا عظیم قلم کار نصیب ہوا کہ جنہوں نے دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں نہ صرف اردو کو متعارف کرایا بلکہ عاشقان اردو کی بزم آرائیوں میں بھی برابر کے شریک رہے۔ادب کی مختلف اصناف مثلاً تحقیق، تنقید، شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، رپورتاژ، خاکہ نگاری، سوانح نگاری، ترجمہ نگاری، تاریخ کے علاوہ لسانیات، صوتیات، سمعیات، کلاسیکی ادب، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے ادبی رجحانات پر جو عبور گوپی چند نارنگ کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے ادیب کو حاصل ہو۔موصوف کا مطالعہ نہایت وسیع ہے دراصل ایک ماہر لسانیات ہونے کی حیثیت سے وہ نہ صرف اردو زبان کے ماہر ہیں بلکہ ہندی، انگریزی، فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت بھی جانتے ہیں۔ظاہر ہے اتنی اہم زبانوں کا عالم اپنے آپ میں ماہر ادبیات نہیں تو اور کیا ہے۔''
>
> (رسالہ انتساب، بھوپال، ص-۶۲)

مندرجہ بالا کتابوں کے عنوانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے قدیم و جدید اردو ادب کا پورا منظر نامہ پیش کر دیا ہے۔گویا ادب کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا پروفیسر نارنگ نے مطالعہ نہ کیا ہو۔دراصل اردو زبان و ادب کے تئیں ان کا ذوق وشوق انہیں ہر وقت سرگرم عمل رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔کثیر مطالعے اور مشاہدے نے ان میں فکر کی بلندی، اسلوب بیان میں دلکشی اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے

استدلالی طرز اظہار کی خوبی پیدا کر دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پروفیسر نارنگ کی تحریروں اور تقریروں سے ہر کوئی محظوظ ہوتا ہے۔وہ زبان کی اہمیت و افادیت اور اس کے صحیح برتاؤ سے بخوبی واقف ہیں اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو اپنے جذبات و احساسات، افکار و نظریات یا تجربات و مشاہدات کی افہام و تفہیم میں نہایت متانت اور وسیع النظری سے کام لیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آپ کی تنقیدی کتابوں کے حوالے سے نارنگ کی روشن خیالی وسیع النظری گہرے مطالعے اسلوب کی رنگارنگی بالخصوص ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے علاوہ ساختیات اور پس ساختیات جیسے تمام ادبی افکار و نظریات سامنے آجاتے ہیں۔جن کے مطالعہ سے ہمیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔آپ کی تنقید نگاری کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> ''پروفیسر نارنگ نے بڑی متانت کے ساتھ اس طرح ان تمام اہم ادبی رجحانات یا فکر و فلسفے پر روشنی ڈالی ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔دراصل گوپی چند نارنگ کسی بھی ادبی تحریک یا رجحان کے امام یا علمبردار نہیں ہیں۔............وہ ایک نرم دل منکسر المزاج وسیع المشرب، دوراندیش اور اردو تہذیب کا ایک ایسا بلند ترین اور روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں کہ شاید ہی ایسا مینار اردو ادب کو آنے والے وقت میں نصیب ہو۔''
>
> (رسالہ انتساب، بھوپال، ص-۷۰)

لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ گوپی چند نارنگ نے قاری اساس تنقید کو اہمیت دی ہے۔کیوں کہ ان کا یہ نظریہ تھا کہ متن کے ہئیتی خصائص ہمیشہ کے لئے مقررہ ردعمل یا متعینہ افہام و تفہیم کی ضمانت نہیں دے سکتے بلکہ معمولاً قاری کو معنی اخذ کرنے کی آزادی ہے۔فنکار کے متعلق فرماتے ہیں کہ کسی ایک نظریے کی پابندی سے فکر کی تازہ کارانہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو کے لسانیاتی اور ثقافتی ناقدین کی مختصر فہرست میں گوپی چند نارنگ کا نام سب سے اوپر رکھا جاتا ہے۔جدیدیت کے تعلق سے گوپی چند نارنگ کا تنقیدی شعور ملاحظہ کیجئے :

> ''جدیدیت نے ادب کی ادبیت اور ذہنی آزادی پر زور دیا اس دعوت میں بڑی کشش تھی۔اس کی ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے مصنف کو تو رد کیا ہی تھا قاری کو بھی رد کر دیا اس لئے نئے شعور کا نظریاتی موقف بے معنی ہو جاتا ہے۔''
>
> (رسالہ، انتساب، بھوپال، ص-۱۱۷)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ نارنگ نے جدیدیت کے مجہول کردار کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

پروفیسر نارنگ نے اسلوبیات کے حوالے سے اقبال، انیس اور میر کے جن محاسن کو طشت از بام کیا ہے وہ نہ صرف مستند و معتبر ہیں بلکہ اقبالیات، انیسیات اور میریات کے مطالعہ کے لئے نئے ابواب بھی وا کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ترقی پسندیت کی ماہیت و مقصدیت اور جارحیت پر بھرپور بحث کرنے کے بعد آزادانہ اظہار کی غرض سے جدیدیت کے وجود میں آنے کی خاطر خواہ توجیہہ پیش کی ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ اول الذکر بے جا سختی اور اصول پسندی کی انتہا کا شکار ہوکر اپنی دلآویزی کھو بیٹھی تو ثانی الذکر اپنی انتہائی بے اصولی اور ابہام پسندی کی وجہ سے اپنی مقبولیت گنوا بیٹھی جس کے لازمی نتیجے کے طور پر مابعد جدیدیت کو مسند قبولیت حاصل ہوگیا۔ ان کے اس طویل مباحثہ پر مشتمل اس معروضی تلخیص کی ادعائیت کی دریافت اور توثیق کے لئے ان کے تنقیدی رشحات خصوصاً ''ترقی پسندی''، ''جدیدیت مابعد جدیدیت''، ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں'' اور ''مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ شارب ردولوی رقم طراز ہیں :

''گوپی چند نارنگ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا شگفتہ اسلوب ہے،
تنقید میں قدم قدم پر اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن وہ جو بات کہتے ہیں اپنے
دائرہ کار میں پارے استدلال اور مدلل انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے تجزیات
کو تنقید کی استدلالی ساختیت (Argumentative Structure)
کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔''

(رسالہ، انتساب، بھوپال، ص-۱۲۶)

صوتیات، معنیات، تعلیم و تدریس، لسانیات و اسلوب، شعریات و سماجیات، ساختیات و پس ساختیات، کتابیات و لسانی تشکیلات اور مسائل، املا و لغات سے لے کر اہم اصناف سخن مثلاً مثنوی، غزل، دوہا، جدید نظم، افسانہ، ناول، سفرنامہ اور مرثیہ تک شاید ہی کوئی موضوع ہوگا جس پر ڈاکٹر نارنگ نے قلم نہ اٹھایا ہو اور تحقیق و تنقید کا حق نہ ادا کیا ہو۔ گوپی چند نارنگ نے ایک انٹرویو میں کہا ہے :

''اتنی بات صاف ہے کہ تنقید اب بچوں کا کھیل نہیں، آپ تاثراتی باتیں کہہ
کے ٹال نہیں سکتے۔ تنقید کی دنیا میں اب تھیوری کی جانکاری ضروری ہے۔''

نارنگ صاحب نے ''تھیوری اساس تنقید'' کو ''پس ساختیاتی تنقید'' یا ''مابعد جدید تنقید'' سے موسوم کیا ہے۔ یہی ''مابعد جدید تنقید'' اپنی جامعیت اور معنویت کے لحاظ سے عہد جدید میں مروج ہے اور

اس پر بحث اردو ادب میں گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ اس رجحان کے تحت ڈاکٹر نارنگ نے انتہائی منطقی انداز میں اردو دنیا کو گرانقدر کتابیں دیں اور اردو تنقید کے دامن کو مالا مال کیا۔ نارنگ صاحب مینارۂ تنقید ہیں جن سے نئی نسل روشنی حاصل کررہی ہے۔

اول درجے کی تنقید، فکری اور عملی ہوتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے یہاں تنقید کے یہ دونوں پہلو ملتے ہیں، مگر دونوں کا تناسب یکساں نہیں۔ ان کے یہاں فکری عناصر وہاں ظاہر ہوئے ہیں، جہاں ان کی تنقید کو بعض عملی مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں مجرد فکر سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی تنقید دو قسم کے عملی مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔ مستقل اور عصری مسائل۔ یہ تقسیم مسائل کی نوعیت کی بنیاد پر نہیں، ان کے دائرہ عمل کی رو سے ہے۔ مستقل مسائل اصل میں ثقافتی مسائل ہیں اور عصری مسائل تاریخ ادبی مسائل ہیں۔ انہیں بالترتیب Synchronic اور Diachronic کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر مسائل وہ ہیں جو اردو ادب کو ایک مخصوص ثقافتی صورت حال کی وجہ سے درپیش ہیں۔ دوسری قسم کے مسائل و سوالات معاصر اردو ادب کی تاریخی صورتِ حال سے پیدا ہوئے ہیں۔ (ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں تاریخی صورت حال سے مراد ایک خاص عہد کی منفرد و مخصوص صورت حال ہے)

مختصر یہ کہ گوپی چند نارنگ کی تنقید ایک مستقل نوعیت کے تہذیبی مسائل سے تعرض کرتی ہے تو دوسری طرف ادب کے عصری سوالات کو بھی موضوع بناتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ نارنگ صاحب نے نہ صرف اردو ادب کے عصری سوالات کو مرتب اور واضح کیا بلکہ ان کے ضمن میں ایک ایسا موقف بھی اختیار کیا بعد ازاں جس نے اردو ادب میں ایک نئے ڈسکورس کی بنیاد رکھی۔ یہ آواں گارد کردار اردو کے بہت کم نقادوں کے حصے میں آیا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ اس وقت اردو میں مابعد جدیدیت پر جو مباحث ہو رہے ہیں ان کی بنیاد نارنگ صاحب نے رکھی ہے۔

Dr. Md. Fazlur Rahman
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
J. L. N. M. College
Sursand, Sitamarhi
Bihar

ڈاکٹر شبیر احمد

اردو غزل کی منفرد آواز: علیم اللہ حالی

اردو غزل ایک خاص صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس صنف کو عروج کے زینے طے کرانے والوں کا ایک جم غفیر موجود ہے۔ ابتدا ہی سے اردو غزل کو فروغ دینے میں غزل گو شعرا فعال قلم رہے ہیں۔ جہاں تک اردو غزل کا عصری منظرنامہ کی بات ہے تو عصری اردو غزل بھی انسانی زندگی کے مختلف شیڈس کو سامنے لانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ آج کے شعرا ادب برائے زندگی پر خصوصی طور سے توجہ دیتے نظر آتے ہیں۔ انہی شعرا میں علیم اللہ حالی کا نام بھی خاص طور سے اہم ہے۔ جو آج اردو غزل کے فروغ میں اپنی قلمی معاونت دے رہے ہیں اور اردو غزل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حالی کی غزل اسے نیا رنگ و آہنگ عطا کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غزل اردو شعری روایت کا سرچشمہ ہے۔ آپ کی شعری حسیت کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''علیم اللہ حالی کی شاعری میں جدت پسندی کے اثرات کو پورے طور پر
محسوس کیا جا سکتا ہے، جو اکیلے پن، تنہائی، ناکامی اور لاحاصلی سے
عبارت ہے اور اس کے نتیجے میں غزلوں میں جانوروں کے نام سے لے کر
مختلف اور تجریدی کیفیات جا بجا موصوف کی غزلوں کا بھی حصہ بنی ہیں۔''

(لفظ آواز صورت گری، علیم اللہ حالی، ص-۱۳)

اس اقتباس کی روشنی میں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ علیم اللہ حالی نے اپنی غزلوں میں زندگی کے مختلف شیڈس کو جگہ دی ہے مثال کے طور پر برصغیر کی آزادی، سرمایہ دارانہ نظام کی شکست و ریخت، فسادات، ہجرت انسانی اقدار کی پامالی وغیرہ۔ مختصر یہ کہ سماجی، سیاسی، ثقافتی و تہذیبی ہر صورتحال آپ کی غزلوں میں جلوہ نما ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علیم اللہ حالی نے نامساعد حالات میں اپنے بالیدہ شعور کی بنیاد پر نئے افکار کو اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔ آپ کی غزلوں میں آپ کی فکری بالیدگی اور تخلیقی ندرت اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اور آپ کی غزلیں اپنے عہد کی بہترین ترجمان بھی تسلیم کی جائیں گی۔ ساتھ ہی آپ کی غزلوں میں آپ کی نظریہ حیات اور مشاہداتی قوت بھی صاف طور سے جلوہ نما ہے۔ یہ

تمام باتیں اس لئے ممکن ہیں کہ علیم اللہ حالی کا یہ یقین تھا کہ شاعری اپنے لئے ہوتی ہے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کسی شاعر کا کلام دوسروں کے لئے شجر ممنوعہ ہو جائے بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ شاعر اپنے تئیں اور اپنے احساس و اظہار کے تئیں مخلص ہو وہ باہر کے قاری سے نہ مرعوب و متاثر ہو اور نہ بیزاری محسوس کرے۔ اس ضمن میں علیم اللہ حالی رقم طراز ہیں :

''میری شاعری میں میرا روئے سخن خود میری طرف ہے۔ مجھے اعتراف ہے
کہ میرے شعری اظہار میں یہ عجوبہ کاریاں موجود ہیں۔''

(علیم اللہ حالی حیات اور شعری، تنقیدی خدمات، ڈاکٹر فہیم احمد، ص-۱۳۲)

اس طرح اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ علیم اللہ حالی کا ماننا ہے کہ شاعری کا سارا معاملہ ذاتی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علیم اللہ حالی شاعری کو ذاتی انفرادی اور تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں کا حامل ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اچھی غزلیہ شاعری کا بنیادی جوہر فکری آہنگ کے ساتھ خوبصورت ردم بھی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ علیم اللہ حالی نے اپنی لگن اور تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر بہترین غزلیں کہی ہیں جن کا مطالعہ ہر قاری خشوع اور خصوع کے ساتھ کرتا ہے۔

علیم اللہ حالی کے اب تک چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ سفر جلتے دنوں کا (۱۹۷۸ء) نخل جنوں (۱۹۸۹ء) لفظ آواز صورت گری (۲۰۰۰ء) اور عکس خواب (۲۰۱۵ء)۔ آپ کے یہ تمام مجموعے میں شامل غزلیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ آپ نے روایت سے مکمل طور پر علاحدگی اختیار نہیں کی اور نہ ہی مکمل طور سے روایت کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ آپ کی غزلیہ شاعری کتنی عمدہ ہے اس سلسلے سے چند اشعار دیکھئے ؎

الفاظ تھک کے بیٹھ گئے راہ میں مگر
طے ہو سکا نہ آج بھی اظہار کا سفر

سفر ہے دھند کا تو کوئی رہنما لے جا
مرا سکوت نہ ہو تو مری صدا لے جا

بکھر کے چھوٹ نہ جاؤں تری گرفت سے میں
سنبھال کر مجھے اے موج خوش ادا لے جا

آپ کی ان غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہاں مشاہدات و تجربات سادگی کا حسن لئے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ سادگی کا حسن اور تخلیقی فکر کی آنچ قارئین ادب کو کافی متاثر کرتی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ کی غزلیں جمالیاتی انبساط عطا کرتی ہیں۔ کیوں کہ علیم اللہ حالی فنون یا تخلیقی آرٹ کی جمالیات سے خوب واقف ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ آپ کی غزلوں میں ایک نئی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں رومانیت کے ساتھ جمالیات بھی موجود نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھئے ؎

اس میں اک اک منظر میں دیکھوں   اسے ہر شے کے اندر چاہتا ہوں
کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص   بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا
اداسی کے آنگن میں تیری طلب کی   عجب خوشنما اک کلی کھل رہی ہے
سبیلیں مرے نام کی اور بھی ہیں   مگر پیاس مجھ کو تری بوند کی ہے
ان پر نئی رتوں کے نشان بن چکے ہیں آج   جس پتھروں پہ نام تھا اپنا لکھا ہوا

مذکورہ بالا اشعار میں منفرد انداز بیان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں نئی رومانیت کے عمدہ جمالیاتی تجربے بھی ہیں۔ جن سے شاعر کا مزاج ومنہاج کیا ہے اس کا بخوبی اندازہ ہمیں ہوجاتا ہے۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ آپ کی غزلیہ شاعری سادگی کا حسن لئے ہوئے ہے جن میں کلاسیکی رچاؤ اور کلاسیکی آہنگ بھی موجود ہے۔ مطلب یہ کہ علیم اللہ حالی کا مشاہدہ وتجربہ قاری کے احساس وجذبے سے قریب نظر آتا ہے۔ رومانی فضا جس طرح ملتی ہے اسی طرح حالی کی غزلیں اپنے عہد کی بہترین ترجمان بھی تسلیم کی جائیں گی۔ جن میں ان کا عمیق مطالعہ اور تجرباتی نگاہ کارفرما نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ آپ کی غزلیں جدید لب ولہجے اور کلاسیکی رچاؤ کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس سلسلے سے چند اشعار دیکھئے ؎

میں زہر سنگ اس تیرگی میں جی لوں گا   تو اپنی نرم شعاعوں کا قافلہ لے جا
کوئی پتھر کا نشاں رکھ کے جدا ہوں ہم تم   جانے یہ پیڑ کس آندھی میں اکھڑ جائے گا
اک آگ تھی جو پھیل گئی یاں سے واں تلک   شعلہ تھا یہ زمیں کا مگر آسماں جلا

یہ تمام اشعار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ علیم اللہ حالی نے غزل کی پابند کلاسیکی صنف پر قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر رئیس اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''ان کے یہاں سدابہار کلاسیکی صنف کے سارے آداب اور دروبست کا احترام ملتا ہے۔'' ہم اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ علیم اللہ حالی اکثر وبیشتر غزل کے روایتی رموز وعلائم کا استعمال بھی کرتے ہیں، لیکن ان کی غزلوں کو ہم روایت کا ترجمان بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ علیم اللہ حالی جس طرح روایتی رموز وعلائم کو نئی زندگی کی کشمکش کے اظہار کا وسیلہ مانتے ہیں وہیں دوسری طرف نئی امیجری کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

آپ کی غزلیہ شاعری کے سلسلے سے پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں :

''یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ حالی کی غزل میں غم جاناں اور غم دوراں کی تفریق بھی تحلیل ہوتی نظر آتی ہے۔''

(عکس خواب، علیم اللہ حالی، فلیپ)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ علیم اللہ حالی کی غزلیہ شاعری ذات اور زندگی کے

مسائل اور نامساعد حالات کی بہترین ترجمان ہیں۔ اس سلسلے سے چند اشعار دیکھئے ؎

خوں صفت منظر کا جاری ہے یہاں رقص جنوں   وسعت نظارہ آنکھوں کو ابھی مت دیجئے
پتھروں پر چھا گئیں شادابیاں   کام آخر آگیا مرا ہو
وقت کے پتھراؤ سے میرا وجود   ریزہ ریزہ منتشر ہے چار سو

مذکورہ بالا تمام اشعار میں زندگی کے تمام ترنشیب وفراز جلوہ نما ہیں۔ ساتھ ہی یہاں اثر آفرینی اور شائستگی بھی ہے۔ آپ ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔ آپ کی غزلیہ شاعری انفرادیت کا حامل نظر آتی ہے۔ کیوں کہ یہاں آپ کا وسیع مطالعہ اعلیٰ ذہانت اور خداداد صلاحیت کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ کی غزلیہ شاعری کے سلسلے سے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ آپ نے جدیدیت کو فیشن کی طرح نہیں برتا ہے بلکہ زندگی کی سچی ترجمانی کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسردگی محرومی بیزاری، تنہائی وغیرہ کا کرب آپ کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سلسلے سے ہم اس بات کا بھی اعتراف کرسکتے ہیں کہ آپ کی اضطرابی کیفیت محض آپ کی نہیں ہماری بھی ہے ہمارے معاشرے کی بھی ہے بلکہ ساری دنیا کی ہے۔ اس سلسلے سے علیم اللہ حالی کے شعری مجموعے میں بیشتر غزلیں مطالعہ کے لئے مل جائیں گی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لگا کر گیا کون دروازہ پھر   اگر کوئی کمرے کے باہر نہ تھا
دشمنی کا سراغ پالو گے   دوستوں کو ٹٹولتے رہنا
گراں ہونے لگی ہے جس کی قربت   اسی کا قرب اکثر چاہتا ہوں
آگاہیوں کی بھیک ملی ہے کتاب سے   محروم ہوگئے ہیں بصیرت کی آب سے

مذکورہ بالا اشعار میں آج کے فرد کی تنہائی اور نامساعد حالات کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ بے یقینی زمانے کا نشیب وفراز کس طرح فرد کو کرب میں مبتلا کرتا ہے اس کی بھرپور عکاسی مذکورہ بالا اشعار میں ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ آپ کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ علیم اللہ حالی اپنے غیر معمولی فکر ونظر اور ندرت خیال کی بنا پر اردو شعری منظرنامے پر اپنی شناخت بنانے میں کامیابی پائی ہے۔ آپ کی غزلیں اپنی معنویت اور فنکاری کے سبب ہمارے ذہنوں پر دیرپا اثر رکھتی ہیں۔ علیم اللہ حالی ایک باصلاحیت شاعر ہیں جس کی مثال آپ کی غزلیہ شاعری ہے۔

Dr. Shabbir Ahmad
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
S. N. S. College
Muzaffarpur, Bihar

ڈاکٹر شعیب انصاری

نور جہاں ثروت: غزل کے رزمیہ اظہار کی شاعرہ

نور جہاں ثروت کا شمار 1980ء کے بعد کی اہم شاعرات میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 28 نومبر 1949ء میں دہلی میں ہوئی اور 17/ اپریل 2010ء میں ان کا انتقال بھی دہلی میں ہی ہوا۔ان کے والد فضل الرحمٰن خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن ان کے گھر پر ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔انہیں نشستوں کے ذریعے نور جہاں ثروت کی ذہنی آبیاری ہوئی اور انہوں نے تک بندی شروع کر دی جو دھیرے دھیرے شعر گوئی میں تبدیل ہوگئی۔نور جہاں ثروت نے دلی کالج سے بی۔اے پھر بعد میں 1971ء میں ایم۔اے کیا۔کچھ دنوں تک وہ ذاکر حسین کالج کے شعبہ اردو میں درس و تدریس سے بھی وابستہ رہیں لیکن بعد میں انہوں نے پیشے کے طور پر صحافت کو اختیار کیا۔ثروت صاحبہ سے متعلق عظیم اختر لکھتے ہیں :

> ''آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اردو سیل اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ کے تجربات سے گزر کر 1980ء میں جب دہلی سے روز نامہ قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کے ادارتی عملے میں شامل ہوگئیں، اس وقت تک اردو روز ناموں کی صحافت خواتین کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اردو اخبارات میں خاتون ورکنگ جرنلسٹ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ثروت نے اپنی خداداد ذہانت و قابلیت اور صلاحیت سے نہ صرف دلّی کے صحافتی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کی بلکہ قومی آواز کے ادارے میں جہاں ایک سے ایک تجربہ کار اور منجھا ہوا صحافی موجود تھا، قلیل عرصے میں اپنے لیے ایک مقام بھی پیدا کر لیا.........1986ء میں لیبر یونین کے ہنگاموں کی وجہ سے ''قومی آواز'' کی اشاعت بند ہوئی اور انقلاب پبلیکیشنز لمیٹڈ بمبئی نے ایک اچھے اخبار کی کمی پورا کرنے کے لیے دہلی سے روز نامہ انقلاب کی اشاعت شروع کی تو نور جہاں ثروت دہلی ایڈیٹر کے طور پر انقلاب سے وابستہ ہوگئیں۔۔''[1]

عظیم اختر نے اپنے مذکورہ اقتباس میں بہت ساری معلومات ثروت صاحبہ کے متعلق جمع کر دی ہیں لیکن انہوں نے نور جہاں ثروت کی جس خداداد ذہانت کا ذکر کیا ہے وہ دلی میں آج بھی مشہور ہے اور اسی ذہانت کا بھرپور پرتو انکی شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''بے نام شجر'' کے نام سے 1995ء میں شائع ہوا جس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔مزاج کے اعتبار سے نور جہاں ثروت کا تیور ہمیشہ باغیانہ رہا اور وہ تادم حیات تانیثیت کی ہمنوا رہیں۔ان کا نظریہ شعر بھی بہت واضح ہے کبھی کبھی شاعر جب اپنے بارے میں یا اپنی شاعری کے حوالے سے کوئی بات کہتا ہے تو اس کے عقب میں اس کا نظریۂ شعر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ضروری نہیں کہ شاعر کی ہر بات کو سچ مان کر اسی کی روشنی میں ہم اس کی شاعری کا جائزہ لیں لیکن افتادِ طبع کی تفہیم میں کبھی کبھی خود فنکار کی رائے بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔لہٰذا نور جہاں ثروت کے نظریہ شعر کی تفہیم کے لیے خود انہیں کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''شاعری کی اصل بنیاد احساس و فکر ہے، لیکن آج کا انسان حسنِ لطیف اور فکر جمیل سے کوسوں دور ہوگیا ہے۔تمام تر سماجی اور انسانی قدروں، تیز رفتار اولاد کی ٹھوکروں میں ہیں اور اپنی آخری سانسیں گن رہی ہیں۔تمام انسانی رشتے بے معنی ہوکر کسی کھنڈر کی فصیل کے سایے میں سر بہ زانو بیٹھے ہیں۔مذاہب اپنی جگہ لیکن وہ مذہبی ادارے ہوں یا سیاسی و سائنسی ادارے استحصال روکنے والا آج کوئی نہیں۔تہذیبوں کے رشتے ٹوٹ کر بکھر چکے ہیں اور یہ بکھراؤ اب مزید شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔بڑھتے ہوئے شہروں، اور بھاری مشینوں کے شور میں آدمی کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی......ہمارے درمیان بڑے سے بڑا حادثہ یوں گزر جاتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جنگ، زلزلہ، قحط، سیلاب، بھوک، بیماریاں، فسادات___ان سب کے بارے میں انسان ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر سوچے شاید اس کی بھی مہلت نہیں۔ایسے حالات میں شاعری بہت مشکل ہوگئی ہے___میں یاسیت کی قائل نہیں لیکن کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ اگر انسان اسی طرح فکر و احساس سے دور ہوتا گیا تو ایک دن شاعری ناممکن ہوجائے گی۔''[2]

مذکورہ اقتباس میں نور جہاں ثروت نے انسان کی مٹتی ہوئی معصومیت کا جو نوحہ پیش کیا ہے وہ ہمارے عہد کے عمومی مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ثروت نے شاعری کو احساس کا نعم البدل تصور کیا ہے اور شاعری کے وجود میں آنے کے لیے حساس معاشرے کی موجودگی پر زور دیا ہے۔اسی اجمال کی تفصیل

ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

میں نے سمجھا تھا محبت کا مسافر جس کو
وہ بھی میری ہی طرح میل کا پتھر نکلا

شعر میں کمال کی بات یہ ہے کہ نور جہاں ثروت نے ''محبت کا مسافر'' اور ''میل کا پتھر'' دو ٹکڑوں کے ذریعے تضادات سے جو اثبات قائم کیا ہے وہ دراصل شئے لطیف یعنی شاعری سے عبارت ہے۔مذکورہ شعر کو جب ہم پہلی بار پڑھتے ہیں تو معمولی بیانیہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کے محاوراتی پٹ پر غور کرتے ہیں تو یہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔اس شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شاعرہ نے پہلے مصرع میں جس شخص کو محبت کا مسافر تصور کیا ہے اور محبت کے مسافر کے استعارے سے جو حرکی مفہوم مراد لیا ہے وہ خود اپنے آپ میں ایک نہایت تخلیقی بیان ہے اور اس کی ضد کے طور پر ''میل کا پتھر'' کے محاورے کا استعمال کیا ہے ایک پہلو جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ دوسرے مصرعے میں خود کو میل کا پتھر تصور کیا ہے جو استادہ رہتا ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔خود پر طنز کرنا آسان نہیں ہوتا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نور جہاں ثروت غزل کے ایمائی ہنر سے خوب خوب واقف ہیں۔ان کی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں۔

ثروت ہر ایک رت میں لپیٹے رہے جسے
وہ نامراد آس کی چادر بھی پھٹ گئی

پورا شعر محاکات، تلازمات اور محاوراتی دھمک سے بھرا ہوا ہے۔پہلے مصرعے میں اس خیال کا اظہار ہوا ہے کہ ہر رت یعنی ہر موسم میں جس کو میں لپیٹے ہوئے رہتی تھی یعنی جو جان سے بھی عزیز زیادہ تھی۔انجام کار وہ آس کی چادر بھی پھٹ گئی،اس پر طرّہ یہ کہ ثروت اسے نامراد کہہ کر مخاطب کرتی ہیں گویا جس تہذیب اور جن قدروں کی پاسداری میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی آخر کار وہ بھی تار تار ہو کر رخصت ہو گئی۔یہ اشاری زبان غزل کے اظہار کے لیے شاید پہلی لازمی شرط ہے،ورنہ غزل کو اشتہار بننے میں دیر نہیں لگتی۔گویا نور جہاں ثروت جن قدروں کا مرثیہ پڑھتی ہیں وہ ایک تلخ حقیقت ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کے متعلق لکھا ہے :

''نور جہاں ثروت کے یہاں فوری سرمستی کے چکا چوند کا عالم نہیں لیکن انسانی رشتوں کے نشیب و فراز اور درد کا ایسا دھندلا دھندلا اجالا ضرور ہے جو روح میں اتر جاتا ہے اور کسی نہ کسی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔یہ شاعری کسی ضرورت کی زائیدہ نہیں، اندر کی آواز ہے، ایک ایسی دوسری آواز، جو پُر شور دنیا کی 'پہلی آواز' کے مقابلے میں سنے جانے کا حق رکھتی ہے۔'' ۳؎

نارنگ صاحب نے اپنے مذکورہ اقتباس میں نور جہاں کی شاعری سے متعلق ایک بے حد اہم بات لکھی ہے کہ یہ شاعری کسی ضرورت کی زائیدہ نہیں۔گویا ثروت کی شاعری احساسات و جذبات کے

ISSN : 2582 - 3612

اظہار کا وسیلہ ہے دیگر مکروہات کا متمنی نہیں۔ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

کرشمہ جو ہر ذاتی کا ہے یا سحر ہے کوئی
حریفوں کو مرے ہر ہر قدم پر مات ہوتی ہے

اس شعر کے مفہوم کی دنیا بھی اس اعتبار سے نئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ شاعرہ کا اپنا ذاتی تجزیہ ہے لیکن اتنی عمومیت اختیار کر گیا ہے کہ جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔جو ہر ذاتی کے ساتھ سحر اور پھر ہر ہر قدم پر حریفوں کی مات ایسے خیالی ٹکڑے ہیں جن کی پشت پر مفہوم کا لاوا ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔شاید ایسے ہی اشعار کی بنیاد پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے یہ رائے دی ہے :

''غزل کے امکانات بڑے امکانات ہیں اور ان میں ہمارے شعرا کی طرف سے برابر اسی طرح اضافہ ہوتا رہتا ہے جیسے اِدھر اُدھر سے بہہ کر آنے والی ندیاں ایک بڑے دریا کی روانی اور قصانی میں اضافہ کرتی ہیں۔موجودہ مجموعہ میں نور جہاں ثروت کی جو غزلیں شامل ہیں ان سے بھی ان کی شاعری میں غزل نگاروں کے نئے امکانات کا پتہ چلا سکتے ہیں۔'' ۴؎

تنویر احمد علوی نے اپنے مذکورہ اقتباسات میں نور جہاں ثروت کی شاعری کو نئے امکانات کی شاعری کا نام دیا ہے جو بالکل درست ہے کیونکہ نور جہاں ثروت کی شاعری کی لفظیات، اظہار کا طریقہ، فنی حربے، تضادات سے اثبات قائم کرنے کا فنی حربہ ایسے اوصاف ہیں جن کا بھرپور تخلیقی استعمال ثروت صاحبہ نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ان کی غزلوں کے تین اشعار کا جو تجزیہ میں نے اوپر پیش کیا ہے اس کی توثیق کے ثبوت کے طور پر ثروت صاحبہ کی غزلوں کے کچھ نمائندہ اشعار ملاحظہ کریں۔

محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا سمٹ گئی
میری پسند کتنے ہی خانوں میں بٹ گئی

تنہائیوں کی برف پگھلتی نہیں ہنوز
دعدوں کے اعتبار کی بھی دھوپ چھٹ گئی

طے کر و اپنا سفر تنہائیوں کی چھاؤں میں
بھیڑ میں کوئی تمہیں کیوں راستہ دینے لگا

گماں یقین کی حد تک کبھی نہیں آیا
بھروسہ اپنی سمجھ پر مجھے زیادہ تھا

تمہاری یاد میں آنکھوں سے جب برسات ہوتی ہے
تو خوشبو میں نہائی چاندنی وہ رات ہوتی ہے

کسی سے ہم مخاطب ہوں کوئی ہو روبرو اپنے
تمہیں کو دیکھتے ہیں اور تم سے بات ہوتی ہے

گلیوں میں اس کے کچھ نہ ملا کرب کے سوا
اب آرزو کا شہر بدلنا پڑا مجھے

مذکورہ تمام اشعار میں ایک تیور اور طنطنہ ہے، فنکار کی انا ہے، زبان کا تخلیقی استعمال ہے، نئے انداز میں بات کہنے کی کوشش ہے، بے حسی سے متصادم فضا ہے، جذبے کی پرورش کا رجز ہے، غرض یہ کہ ثروت کی غزلیہ شاعری اپنے قارئین کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اب آیئے ثروت کی نظموں کے حوالے سے بھی کچھ گفتگو کر لی جائے۔ وہ جہاں ایک طرف غزل کی کامیاب شاعرہ ہیں وہیں ان کی نظمیں بھی کم دلفریب نہیں ہیں۔ ایک مختصر سی نظم ''ٹوٹتی دھڑکنیں'' ملاحظہ کریں۔

پھر بھی ہیں
میرے اس قلب مجروح کی
ٹوٹتی دھڑکنیں
اس کے غم کی امیں
وہ حسیں ادا
وہ ____ حادثہ روح کا
کیا اسے نام دوں
سوچتی ہوں بہت
خواب آزر کا جیسے کوئی ٹوٹ جائے   (ٹوٹتی دھڑکنیں)

نو مصرعوں پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں شاعرہ نے بکھرے بکھرے انداز کے ساتھ اپنے خیالات کو تکمیل تک پہنچایا ہے۔ کہتی ہیں میری مجروح قلب کی ٹوٹتی دھڑکنیں اس کے یعنی محبوب کے غم کی امین ہیں ہر چند کہ وصال یا تعلق بحال نہیں رہا لیکن یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس نظم کے خیال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں وہ کہتی ہیں کہ میرے گھائل دل کی ٹوٹتی دھڑکنیں آج بھی اس کے غم کی امین ہیں یعنی اب کوئی رشتہ نہیں لیکن درد کا ایک رشتہ دل میں باقی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ کہتی ہیں کہ وہ ایک روح کا حادثہ تھا۔ اب تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا نام دیں۔ بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آزر کا کوئی خواب ٹوٹ گیا ہے۔ تلمیحی انداز میں نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن سیدھے سادے لفظوں کے پردے میں احساس و فکر کی چنگاری مفہوم کا جو ہالہ بناتی ہے وہ ہمیں چونکاتی ہے اور شعری ہنرمندی کی داد طلب کرتی ہے۔ انہیں خوبیوں سے معمور ثروت صاحبہ کی دو نمائندہ نظمیں ملاحظہ کریں۔

میں نے لکھا تو تھا
نام دل کے ورق پر اچھوتا کبھی
اور معصوم و پاکیزہ احساس کو
میں نے سینے سے اپنے لگا کر اسے
کتنے سپنے بنے
واہموں سے پرے

ISSN : 2582 - 3612

سوچ کے دائرے
برقی لہروں کی مانند
احساس و ادراک کو
گدگداتے رہے (**سوچ کے دائرے**، ص59)
کبھی کبھی یونہی
کوئی چھوٹی سی بات
دل میں اس طرح گھر کر جاتی ہے
کہ بھول جانے کی کاوشوں کی طرح
پھانس بن کر کھٹکتی رہتی ہے
روح خود ہی کھٹکتی رہتی ہے
(چھوٹی سی بات، نومبر 1977، ص۔70)

مذکورہ نظموں میں بھی احساس کی فراوانی، غم کے شرار، معصومیت کے مٹنے کا نوحہ، درد مشترک کو بانٹنے کا جذبہ، افکار کے واہمے وغیرہ مل کر مفہوم کی ایک نئی دنیا سجائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید اسی سبب سے ابوالفیض سحر رقم طراز ہیں :

''نور جہاں ثروت برصغیر کی ایک جانی پہچانی شاعرہ ہیں ویسے تو ان کی تخلیقات اب تک ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں وہ خود بھی کئی اداروں سے وابستہ رہی ہیں اور صحافت میں بھی اپنی شناخت بنائی ہے مگر 'بے نام شجر' ان کا مرتب انداز میں منظر عام پر آنے والا پہلا شعری مجموعہ ہے ۔ نور جہاں ثروت ایک ذہین اور باصلاحیت خاتون ہیں جنھوں نے زندگی کی بے مروت مبارز طلبیوں کا بہادری سے سامنا کیا ہے۔ وقت کی دھوپ چھاؤں کو جھیلا ہے، جرات سے حوصلے سے مگر خوش اسلوبی، متانت اور تمکنت کے ساتھ، شعر اور شعریات ان کے لیے اوڑھی ہوئی چادریں نہیں، ان کے مزاج کا حصہ ہیں۔ یہ زود نگار بھی ہیں خوش خلق بھی خوش فکر بھی اور خوش کلام بھی۔'' ۵

جناب سحر نے ثروت صاحبہ کی شاعری کے متعلق ایک بے حد اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ متانت اور تمکنت کے ساتھ، شعر اور شعریات ان کے لیے اوڑھی ہوئی چادریں نہیں، ان کے مزاج کا حصہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہیں۔اور جنل شاعری کی یہی وہ پہچان ہے جس کی نمائندگی ثروت کی غزلیہ اور نظمیہ دونوں ہی شاعری میں ہوئی ہے۔

حواشی:۔

1۔ بیسویں صدی کے شعرا دہلی، مرتب: عظیم اختر، ص-1383

2۔ اپنی بات، بے نام شجر ، نور جہاں ثروت، ص-5

3۔ پیش لفظ، گوپی چند نارگ، بے شجر نام، نور جہاں شروت، ص-137

4۔ اظہار وافکار کے دائرے، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، بے شجر نام، نور جہاں شروت، ص-147

5۔ پیکر اظہار کا جہان تخلیقی، ابوالفیض سحر، بے شجر نام، نور جہاں شروت،، ص-153

Dr. Shoaib Ansari
Asst. Professor (Contractual)
Deptt. of Urdu
Kartik Oraon College,
Gumla-835207
(Jharkhand)
Mob: 8271352490

محمد طاہر عزیز خان

جموں وکشمیر کی اردو شاعری میں خواتین کا حصہ

جموں وکشمیر میں اردو شاعری کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن اس مختصر عرصے میں بھی شعرا وادبا کی ایک کہکشاں افق ادب پر نمودار ہوئی ہے۔ان شعرا وادبا نے اردو ادب اور بالخصوص شاعری میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور ریاستی اور قومی سطح پر اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ان میں شاعر کشمیر مہجور سے لے کر غلام رسول نازکی، فاروق نازکی، عرش صہبائی، رفیق راز، پرتپال سنگھ بیتاب، ودیا رتن عاصی، فاروق مضطر، شفق سوپوری، احمد شناس، حکیم منظور اور موجودہ دور کے شعرا جن میں لیاقت جعفری، رؤف راحت، احمد پاشا، عارض ارشاد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو ادب کے فروغ اور شاعری کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے میں خواتین بھی دوسرے شعرا کے شانہ بہ شانہ اپنے حصے کی شمع روشن کرتی آئی ہیں۔کشمیر کی شاعرات میں پہلا قابل قدر نام لل عارفہ کا ہے جنھوں نے اب سے سوا چھ سو سال قبل اپنی شاعری میں حکمت ومعرفت کے مضامین کو پیش کیا ہے۔کشمیر کی خواتین شاعرات میں دوسرا اہم نام حبہ خاتون کا آتا ہے۔حبہ خاتون سے کشمیر میں رومانوی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ان دو شاعرات کے بعد ہمیں ایک زمانے تک کوئی نسوانی آواز سنائی نہیں دیتی۔اس دور کے کشمیر میں فارسی زبان کا بول بالا تھا۔البتہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے حکومت سنبھالنے کے بعد جب اردو یہاں کی سرکاری زبان قرار دی گئی تو لوگوں نے فارسی کے بجائے اردو میں اپنے خیالات نوک قلم کرنے شروع کیے۔پچھلے چالیس پچاس سالوں میں کئی شاعرات بھی منظر عام پر آئی ہیں جن میں رخسانہ جبیں، ترنم ریاض، نصرت چودھری، سیدہ نسرین نقاش، صاحبہ شہریار، شبنم عشائی، نکہت فاروق نظر، پروین راجہ، درخشاں اندابی، شبینہ آرا وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

رخسانہ جبیں جموں وکشمیر کی غزل گو شاعرات میں اہم مقام رکھتی ہیں۔انھوں نے غزل کے علاوہ نظمیں بھی کہیں ہیں لیکن غزل میں ان کے اصلی جوہر نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غزل کی فنی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ کافی وسیع ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں زبان وبیان کی خامیاں کم دکھائی

دیتی ہیں۔ان کی زبان نہایت شستہ اور عام فہم ہے۔کسی بھی تخلیق کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے لیے تخیل کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔رخسانہ جبیں کا زندگی کے متعلق مشاہدہ عمیق ہے۔وہ اپنے آس پاس سے بخوبی واقف ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنے کلام میں بہ احسن انداز کرتی ہیں۔انھوں نے جس دور میں شاعری شروع کی وہ دور اردو ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دور کہلاتا ہے لہٰذا ان رجحانات کے اثرات بھی ان کے کلام میں واضح طور دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے استعارات اور تلمیحات کو بھی نئی معنویت دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔اب تک ان کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے البتہ ان کا کلام ملک کے موقر رسائل و جرائد میں تواتر سے شایع ہوتا ہے۔ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

اجداد وراثت میں گھٹن چھوڑ گئے ہیں — تعمیر کریں اب کے مکاں اور طرح کے
تیری خاطر ہی کٹوائے سر بے شمار — قیمت ایسی چکا دی ہے بھاری زمیں
پھوٹی اس کی پسلی سے تو ٹیڑھی — وہ سیدھا تیر جیسا میں کماں ہوں

صاحبہ شہریار اردو غزل کا ایک اہم نام ہے۔ان کے اب تک چار شعری مجموعے بعنوان ''شاخِ لرزاں'' ۲۰۰۴، ''برگِ چنار'' ۲۰۰۷، ''آگہی کا درد'' ۲۰۱۴ اور ''صریر خامہ'' ۲۰۱۷ منظر عام پر آ چکے ہیں۔فکر و فن کی پختگی اور زبان و بیان کا بہتر استعمال ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔وہ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتی ہیں جس سے کلام میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔صاحبہ شہریار کے یہاں موضوعات میں کوئی تنوع نہیں ہے وہی موضوعات ہیں جو اردو غزل کی روایت رہے ہیں۔حسن و عشق کے معاملات،عصری حسیت کا اظہار،اپنے آس پاس کے حالات کی عکاسی وغیرہ وغیرہ۔وہ زندگی کے پیچ و خم اور مصائب سے فرار کا راستہ اختیار نہیں کرتی ہیں بلکہ ان کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتی ہیں۔طبقۂ نسواں کی بے چارگیوں اور محرومیوں کا انھیں بے حد احساس ہے وہ اس کا اظہار اپنے کلام میں جگہ جگہ کرتی ہیں۔ان کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد علی برقی لکھتے ہیں۔

''ان کے اشعار نرم لب و لہجے میں زندگی کے تلخ حقائق،کرب ذات اور سوز دروں کی صدائے بازگشت ہیں۔ان کا شعور فکر و فن، ندرت زبان و بیان، مضمون آفرینی، بلند پروازیٔ خیال و عصری حسیت کا مظہر ہے۔''

(ص۔۱۵ صریر خامہ۔صاحبہ شہریار)

ان کے کچھ دیکھیں:

کچے دھاگے ہیں یہ رشتے ناطے — ان کو توڑ سکو گے تم یہ جانے دو

ISSN : 2582 - 3612

دور تک کیوں خوف سا طاری ہے یہ سوچو ذرا — دور تک راہوں میں کوئی بھی نظر آتا نہیں
آندھیوں سے بھی نہ بچ پایا کبھی — دل میں اک ایسا دیا جلتا رہا

ترنم ریاض کا نام اردو ادب کے قاری کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔وہ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ان کی پہچان ان کے ناول ''برف آشنا پرندے'' سے قائم ہوئی ہے۔اس ناول کے علاوہ ''فریبِ خطۂ گل'' کے نام سے چار ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں۔ ''یہ رنگ زمیں!''،''یمبر زل''اور''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔انھوں نے دو شعری مجموعے''پرانی کتابوں کی خوشبو'' اور''زیرِ سبزہ محوِ خواب'' اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ترنم ریاض نے غزل کے مقابلے میں نظمیں زیادہ کہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں پر بھی نظم کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، زندگی کی بوقلمونی کا احساس اور کشمیر کے حالات و واقعات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ علامتی انداز بیان سے اپنے کلام میں معنی و مفاہیم کی دنیا بساتی ہیں۔اس ضمن میں ان کی نظمیں ''آدم''،''کچھ نہیں ایسا ہوا''اور''بارش'' قابل مطالعہ ہیں۔''مرے بڈشاہ''اور''زنگ آلودہ قلم'' بھی کافی دلچسپ نظمیں ہیں۔ان کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی دشمن نہ ہے دلدار اپنا — یہاں کیا دلِ بیمار اپنا
سڑک سونی، ہر اک گوشے میں فوجیں — پڑا ہے بند کاروبار اپنا

ڈاکٹر نصرت چودھری رومانوی لب و لہجے کی عمدہ شاعرہ ہیں۔انھوں نے اپنی قلبی واردات کو ہی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ان کے انداز بیان کی روانی ہے۔ان کے اشعار تغزل کی عمدہ مثالیں ہیں۔ان کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

احساس کی رگوں سے ٹپکتا رہا لہو — ہم کو کسی سے پیار دوبارہ نہ ہو سکا
ان کے چہرے کو جب سے دیکھا ہے — آسماں پر بجھے سے اختر ہیں
تپتے صحرا میں کھڑی سوچ رہی ہوں نصرت — آج وہ پاس مرے آئے تو دریا مانگوں

''ہتھیلی کا چاند'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔نصرت کا انتقال ۲۰۱۵ میں ہوا۔

سیدہ نسرین نقاش ایک منفرد لب و لہجے کی شاعرہ ہیں۔غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے اور اسی میں ان کے تخلیقی جوہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ان کی غزلوں میں عصری حسیت کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل اور معاملات کی عکاسی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔جدائی، یادیں اور تنہائی کے جذبات کو انھوں نے فنی حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی فکر میں پختگی اور مشاہدے میں گہرائی ہے۔نسوانی مسائل کو بھی انھوں نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔بقول حامدی کاشمیری:

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''نسرین کی غزلوں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں، اول ان کے لہجہ کا نسوانی آہنگ جوان کی شخصیت کے گداز، درد اور خلوص کا زائیدہ، دوم ان کے طرز فکر کی سادگی اور فطری پن، وہ زندگی میں جن تجربات سے گزرتی ہیں انھیں سچے دل سے غیر مصنوعی انداز میں پیش کرتی ہیں۔''

(دشت تنہائی۔نسرین نقاش۔ص۔۱۹)

ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بھولی یادیں بھی دبے پاؤں چلی آتی ہیں ۔۔۔ تم اکیلے تو آج ادھر آئے ہو

کتنا تھا تلخ اس سے محبت کا تجربہ ۔۔۔ ہر رشتۂ خلوص سے ڈرنا پڑا مجھے

نسرین کی اب تک چار کتابیں ''دشت تنہائی''، ''روحیں جناب کی''، ''تنہائیاں'' اور ''لہو پکارتا ہے'' منظر عام پر آچکی ہیں۔

شبنم عشائی اردو میں نثری نظم نگاری کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔انھوں نے اسی صنف میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کیا ہے۔نظم اگر مختصر ہو تو زیادہ موثر ہوتی ہے۔یہ خوبی شبنم کی اکثر نظموں میں پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں وجودیت کے تصور کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کی نظموں میں ہجر و ملال، نسوانی جذبات کی عکاسی، احساس ذات، کرب تنہائی اور امید و بیم جیسے موضوعات و مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔عطاء الحق قاسمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک شبنم کی شاعری بنیادی طور پر ہجر کی شاعری ہے وہ یہ مضمون سو رنگ میں باندھتی ہیں اور ہر مرتبہ غم کی ایک شدید لہر پڑھنے والوں میں منتقل کرتی چلی جاتی ہیں۔'' (من میں جمی برف۔شبنم عشائی۔ص۱۰۹)

ان کے اب تک پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔''اکیلی'' ان کا پہلا مجموعہ ہے۔''میں سوچتی ہوں''، ''من بانی''، ''کتھارسس'' اور ''من میں جمی برف'' ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں۔

نکہت فاروق نظر بھی مشق سخن کرتی ہیں ۔غزل کہتی ہیں ۔کرب تنہائی ، ہجر و رفاقت اور نسوانی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔کچھ شعر دیکھیں۔

تنہائی کا اک موڑ تھا ایسا بھی سفر میں ۔۔۔ جب اپنے آپ ہی سے بچھڑنا پڑا ہمیں

کیسی مٹی سے بنی ہوں تمھیں کیا معلوم ۔۔۔ بن کے سو بار بگڑتی ہوں صبح ہونے تک

ان کا شعری مجموعہ ''قہر نیلے آسماں کا'' شایع ہو چکا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

فریدہ کول بھی شاعرہ ہیں۔غزل کہتی ہیں۔''سلگتی بہاریں'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔

کوئی بھی تو نہیں کہ بات کروں ۔۔۔ ایک خالی مکان میں رہتی ہوں

درخشاں اندرابی اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں شاعری کرتی ہیں۔شعر دیکھیں۔

یہ اور بات کی احساس کھا گیا دھوکا ۔۔۔ تمھاری یاد تھی شامل تمھیں بھلانے میں

جموں کشمیر میں خواتین پچھلے تین چار دھوں میں ہی منظر عام پر آئی ہیں۔اگر چہ کے ان کی تعداد کم ہے تاہم اس مختصر تعداد میں جو شاعرات شامل ہیں وہ اپنے فکر و فن اور انداز و اسلوب میں پختگی رکھتی ہیں۔انھوں نے مختلف موضوعات اور مسائل کو اپنے کلام میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی اس مشق سخن سے ابھی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

Mohamad Tahir Aziz Khan
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Jamia Millia Islamia
(New Delhi)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر اعجاز احمد

ناول ''مکان'' فن کے آئینے میں

اردو ناول نگاری کے منظر نامے پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس صنف کو عروج کے زینے طے کرانے میں ہندو پاک کے ناول نگار نے اپنی قلمی معاونت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ صنف آج بھی پھل پھول رہی ہے۔ زندگی کے سارے رموز و نکات کو حقیقت پسندانہ انداز میں ایک ناول نگار اپنے ناول میں پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ناول نگاروں کی ایک جم غفیر موجود ہے جنہوں نے اس صنف کو وسعت عطا کرنے میں اپنے قلم کو رواں دواں رکھا ہے۔ انہی ناول نگاروں کی صف میں ایک اہم نام پیغام آفاقی کا بھی ہے۔ جن سے تین ناول یادگار ہیں مکان، پلیتہ اور دوست۔ آج پیغام آفاقی ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ان کی نگارشات ہمیں ان کی اہمیت کا احساس کراتی رہتی ہیں۔

ناول مکان کا مطالعہ اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ نہ ہی اس کے موضوع اور نہ ہی اس کے مقصد اور نہ ہی اس کے تکنیک کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ ناول مکان ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو زندگی جینے کا شعور سکھاتی ہے۔ یہ مکان سمٹ کر ذات اور پھیل کر کائنات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں اپنے عہد کی کہانی اپنی زبان میں کہنے کی کوشش جاری و ساری ہے۔ اسی لئے پوری وضاحت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ناول کا قصہ نیرا کے مکان سے شروع ہوتا ہے اور ختم بھی وہیں سے ہوتا ہے۔ ناول کی امیجری کے لئے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''اور اس نے اپنے آپ سے کہا؟ نیرا۔ دیکھو۔ اس پورے منظر کو غور سے دیکھو۔ انسان کائنات کا ایک نقطہ ہے۔ کائنات کے تمام جانے مانے نقطوں میں اہم ترین۔ کائنات کو اپنے نقطہ نظر سے تولو۔ جانچو۔ اور پاؤ۔ کائنات ہاتھی اور بھینسے اور دریا اور ہوا اور آتش فشاں اور نظام شمسی اور گلیکسز اور وقت کے بھاؤ کی طرح بڑی اوا اپنے آپ میں گم ہے۔ اس کو پکڑنا سیکھو۔ اس کا شکار کر کے اس کو پالتو بنانا اور اس پر سواری کرنا سیکھو۔ کائنات ان پہاڑی وادیوں کی طرح ہے۔ تم اپنی جگہ بدلتی ہو تو تمہارے لئے اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ تم اس کے قدموں تلے آؤ گی تو یہ تمہیں کچل دے گی۔ تم اس کی پیٹھ

> پر بیٹھ جاؤ گی تو تم کو زندگی کی بلندیوں کی سیر کرائے گی۔ سپاٹ مناظر سے باہر نکلو اور ان پہاڑیوں کی سیر کرو۔ دیکھو کائنات ایسی ہے اور یہی کائنات سے تمہارا رشتہ ہے۔''
>
> (ناول مکان: پیغام آفاقی ص ۵۱)

پورا ناول پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نت نئے معنی کھلتے ہیں۔ اسے ناول کا فکری پہلو بھی کہا جا سکتا ہے۔ غور و فکر کا مادہ ہر کردار میں موجود ہے۔ خواہ مرکزی کردار ہو یا ذیلی۔ یہ ناول کائنات کا اشاریہ ہے اسی لئے پیغام آفاقی نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ نیرا نے جب خود کو کائنات کے قدموں تلے ڈالا تو اسے کچلا گیا اور بے جان سی رومانی نیرا خود کو اکیلی محسوس کرنے لگتی ہے۔ لیکن جب خود کو گرفت میں لی اور خود میں اعتماد کیا تو وہ خود سے جیت گئی۔ لہذا یہ کہا جائے گا کہ پیغام آفاقی نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کائنات پر گرفت کے لئے ذات پر گرفت ہونی ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ سفر مسلسل اور مستقل سفر کائنات کی حقائق کی تلاش کا سفر ذات اور کائنات کے رشتوں کی تلاش کا سفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول مکان میں نیرا کے حوالے سے زندگی کائنات اور ذات نہایت بے رحمی سے برہنہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی لئے پورے ناول میں فکر اور خیالات کی ایک روانی ہے۔ یہ ناول عرفان ذات کا اشاریہ بھی ہے۔ اس سلسلے سے خود ناول نگار رقم طراز ہیں :

> "This is an epic describing the factors involved in the conquest as the defeat in struggle between material and life and the power of creativity with all its branches coming out a distinct philosophy of Life "

ناول جیسے جیسے خاتمے یا کلائمیکس کی جانب بڑھتا ہے عنوان یعنی لفظ ''مکان'' کے گرد حیات و کائنات کے کئی ایک فلسفے سمٹ آتے ہیں۔ مثلاً اقتباس نمبر (۲۹) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول ذات و کائنات یا ذات و صفات یا خدا اور بندے یا جسم و روح کے رشتے اور دونوں میں کون مقدم ہے لفظ یا معنی وغیرہ جیسے مسائل کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اقتباس نمبر (۳۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکان ہمارا جسم ہے اور کمار جو مکان چھین لینا چاہتا ہے وہ ہمارے اندر کا شیطان ہے۔ اسی اقتباس میں کسی بہانے سے تعقل پسندی کو بھی انسانی ذات کا جوہر بتایا گیا ہے۔ اقتباس نمبر (۳۱) میں عورت کہ جسے چھوئی موئی کا پودا سمجھا جاتا ہے، ایک سوال قائم کرتی ہے کہ کیا عورتیں بغیر کسی پہرے کے محفوظ نہیں؟ کیا انہیں محفوظ تبھی سمجھا جائے گا یا رکھا جا سکتا ہے

جب وہ سات پردے میں ہوں اگر ایسا ہی ہے تو یہ ساری دنیا بے مکانی کی ایک علامت ہے۔ یا یہ بھی کہ مکان کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل ہے وہ تصور جو انسان کے اندر روح کی طرح ہے۔ تبھی تو اقتباس نمبر (۳۲) میں آلوک ان لوگوں پر طنز کرتا ہے جو مادہ کو ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں جسم یا مکان یا لفظ کو ہی برحق سمجھ لیتے ہیں جب کہ لفظ ہو کہ مکان، وقت کا بہاؤ انہیں بہا کر کہیں دور لے جاتا ہے۔ اس لئے نہ لفظ کا اپنا کوئی معنی ہے نہ جسم دوامی نہ مکان دوامی ہے کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہاں یہ چیزیں دراصل ایک لباس کی حیثیت ضرور رکھتی ہیں۔ یہاں حقیقت کے Solid Validity کے پٹ جانے کی طرف اشارہ ہے جو بہر صورت ایک مابعد جدید رویہ ہے۔ جس کی رو سے حقیقت Multi layred ہے۔

مکان میں جہاں کئی طرح کے موضوعات کی تلاش کی گنجائش ہے وہی اس ناول کو امراؤ جان سے قطع نظر اردو ناول میں دوسرا بڑا انسوانی کردار کی پیش کش کا منفرد ناول کہا جا سکتا ہے۔ پیغام آفاقی کے یہاں تصور عورت یا تانیثی اقدار کا تصور سابقہ ناول نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔

آپ ناول کا صفحہ (19) پڑھئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ عورت کی تعلیم و تربیت کے طریقے کو ہی بدل دینا ضروری سمجھتے ہیں جس طرح کی تہذیب و زبان کی تعلیم انہیں دی جاتی ہے وہ ان کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ''نیرا'' اسی روایتی تعلیم و تربیت سے بغاوت کرتی ہے۔ ناول کا یہ مندرجہ ذیل جملہ عورتوں کی بیداری کے لئے ایک سلوگن ثابت ہوسکتا ہے یا یہی وہ مہا بیانیہ ہے جس نے عورتوں کو اپنی بوطیقا کی تشکیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو مابعد جدید رویے کی ایک شق ہے۔

دراصل نیرا اور اس کے مکان کو بنیاد بنا کر ایک ایسی کہانی لکھی گئی ہے جس کا سیاق و سباق نوکر شاہوں کے ذریعے ملک میں پھیلی زہریلی بدنظمی ہے نیرا جب اس کا شکار ہوتی ہے تو مکان آہستہ آہستہ منظر سے باہر ہو جاتا ہے اور مکان کی جگہ انسان کی بقاء کا مسئلہ جانفزاں نیرا کا مقصد بن جاتا ہے۔ نیرا جو اپنے مکان کو کمار سے بچانا چاہتی تھی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ مکان کو اس دنیا کی پرکھ کا آلہ تصور کرنے لگتی ہے اور اسے اپنی جنگ میں مزہ آنے لگتا ہے۔ ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناول مکان میں آخر کہانی کس کی کہی گئی ہے نیرا کی؟ یا اس مکان کی جو بے جان شئے ہے یا مکان کی کہانی ان لوگوں کی ہے جو ملک کے شہریوں کی نگہداشت اور پاسبانی کے لئے موٹی موٹی تنخواہوں پر رکھے گئے ہیں جو کرسی پر بیٹھتے ہی ایک مشین بن جاتے ہیں اور انہیں کسی بھی دکھی آتما کی پکار سنائی نہیں دیتی جیسا کہ نیرا کے دکھ کو اس کے پروبلم کو یہ لوگ اپنی تجارت کی منڈی سمجھتے ہیں۔ یہ کہانی کسی نیرا یا اس کے مکان کی بھی ہوسکتی ہے اور تیسری دنیا کے ان مسائل کی بھی جس نے لوگوں کے ذہنوں میں ایک نامعلوم خوف کا زہر بھر دیا ہے اور ان سے سچ کہنے سننے اور اسے برداشت کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ اس کہانی میں نیرا ان لوگوں کی آئیڈیل بنتی ہے جو چپ

چاپ ظلم سہے جاتے ہیں اور مروجہ سماجی برائیوں کو رفو کر کے اپنا کام چلاتے ہیں۔ اس طرح نیرا کے کردار و عمل کی روشنی میں ناول نگار نے آج کے ہراس آدمی کو عرفان زندگی اور اصول قدرت کی بحث میں کھینچ لیا ہے جسے کسی امید کسی مشورے یا اپنے حقائق کی تلاش ہوتی ہے اور جو اپنی جنگ میں تنہا ہوتا ہے۔

مکان کی تخلیق کا مقصد اس کے متن میں بھی موجود ہے جو اس طرح ہے۔ (۱) لوکل پولس ایک نام کا ہتھیار ہے (۲) کورٹ ایک ناکام ذریعہ ہے (۳) قانون کی کتابیں پیچیدہ ہیں (۴) حکومت الجھی ہوئی ہے (۵) ملک کے عوام کے ہونٹ بند ہیں۔ تو اس مسئلے کے حل کے لئے نئی دریافت کی ضرورت ہوگی۔

یہ وہ طرز احساس ہے جو پیغام آفاقی کے ناول کو مابعد جدید حالات کا اولین نقش بنا دیتا ہے یعنی ایک نئی بوطیقا کی شدید خواہش کا پیدا ہونا اور مروجہ حکومتی و انتظامی امور کے ناکافی بلکہ اس کی موت کا احساس ہونا تخلیقی سطح پر غالباً سب سے پہلے آفاقی نے اردو میں مابعد جدید رجحان کو پہلی بار جدیدیت کی سکہ بند روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے اردو ریڈر سے متعارف کرایا تھا۔

اب تک کی بحث سے یہ پتہ تو چل ہی گیا کہ اس ناول میں سامنے کے معنی کے علاوہ معنی کی کئی ایک زیریں سطحیں بھی ہیں جو اس کو بڑے ادب کے زمرے میں رکھتی ہیں۔ ہر ناول میں ابتدا اور خاتمہ یعنی کلائمکس ہوتا ہے مگر دنیا کے سارے ناول نگاروں کو ناول لکھتے وقت یہی مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ ناول شروع کہاں سے کرے اور اگر شروع کرے بھی تو اسے اختتام تک کیسے لے جائے کیوں کہ کہانی نہ شروع ہوسکتی ہے نہ ختم کہانی تو وقت کے دریا میں پہلے سے رواں دواں ہے۔ ہر مصنف دریا کے بہاؤ میں کسی ایک پوائنٹ پر آملتا ہے اور پھر ایک پوائنٹ پر الگ ہو جاتا ہے۔ یعنی ناول کے شروع ہونے سے پہلے ایک بسیط زمانہ گذر چکا ہوتا ہے اور ختم ہونے کے بعد بھی ایک بسیط زمانہ ہوتا ہے۔ یعنی ابتدا مطلق ہے نہ انتہا مطلق۔ اس کے بر عکس ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر ناول خا کا تمہ بدی پر نیکی کی فتح یا کسی اخلاقی پیغام پر ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ناولوں کی ابتدا اکثر کسی گاؤں یا شہر کے مناظر فطرت سے ہوتی ہے۔ نئے ناولوں نے اس سے گریز کیا ہے مکان میں بھی مروجہ ہئیت، تکنیک اور اسلوب سے Major Deviation دکھائی دیتا ہے۔

الغرض مکان کے شروع اور اخیر کے جملے میں فن کا رانہ ربط ہے جس سے پورا ناول انسان اور کائنات کے رشتے کی نوعیت کی وضاحت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ پیغام آفاقی نے ناول کی تکنیک میں ایک انوکھا تجربہ کیا ہے۔ آیئے اس ناول کی تکنیک پر بھی ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس کہانی کا بیان کنندہ صرف ناول نگار کی ذات نہیں ہے۔

یعنی کہانی راوی کی زبان واحد غائب کے صیغے میں۔ کیا پوری کہانی راوی بیان کرتا ہے؟ نہیں۔ یعنی راوی کی ہمہ وقت موجودگی اس کے جبر کا احساس اس کہانی کے بیانئے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کہانی کے

بعض حصے کرداروں کی زبان ہے۔ کچھ جگہوں پر خطوط نگاری کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ نیز خواب کے سہارے بھی کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناول میں یکسانیت یا ایک لہجے کی تکرار نہ پیدا ہو اس لئے مسائل مختلف Narrative Strategies کا سہارا لیتے ہوئے بیان کئے گئے ہیں۔ تا کہ (Monotonous Style) اکتا دینے والے انداز سے الگ منتشر آہنگ پیدا ہو نیز ایک خاص طرح کی Heteroglossia کی فضا پیدا ہو جو فکشن کی جان ہے۔

پیغام آفاقی نے مکان کو شاعرانہ اسلوب میں لکھے گئے رومانی ناولوں سے بہت دور رکھا ہے۔ مکان کے لئے شاعرانہ انداز سے گریز کرنا ان کی ذہانت کا ثبوت ہے۔ کہانی پر توجہ دینے کے بجائے انہوں نے کہانی پن کو ایک اسلوب کے طور پر برتا ہے اور اپنے ناول کو ہمہ دان بیانیے کے قریب رکھا ہے۔ یعنی Omnicent Narative سے کام لیا ہے۔

اس بیانیے میں جہاں جہاں کردار ابھرتے ہیں انہیں ''نیرا'' سے اور نیرا کے اندر کے کرب اور سب کچھ بدل دینے کے تصور اور طرز حیات سے مزاحمت کرنی پڑتی ہے۔ الوک ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نیرا کا ساتھ دور تک نہیں دے پاتا تبھی ناول میں اشوک جیسے بھرشٹ اور کرپٹ انسان کا چہرہ سامنے آتا ہے اور اس کردار کے داخل ہوتے ہی مکان میں ایک نئی روح سی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نیرا کو ہر ممکن کوشش کے ذریعے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے۔ کمار کے طرز حیات اور اس کے مقصد کی برآوری کے لئے مدد کرتا ہے مگر نیرا ان کے جملہ پروگراموں کو بے اثر کر دیتی ہے۔ الوک جب نیرا کی مدد کے لئے خود کو تیار کر لیتا ہے تو کمار جو نیرا کا کرایہ دار ہے جس کا واحد مقصد نیرا کے مکان پر قبضہ کر لینا ہے اشوک کے مندرجہ ذیل مکالمے کے ذریعہ ناول نگار واضح کر دیتا ہے :

> ''بوتل اور سولہ سال کی کھول کر، اس نے آنکھ ماری، اس کے سامنے رکھ دیں گے، پھر دیکھیں گے آلوک کدھر جاتا ہے۔''
>
> (ناول مکان: پیغام آفاقی، ص ۷۵)

دراصل مکان پڑھتے وقت ہم اپنے اندر نیرا کے شب و روز کی اذیت اور اس کے اندر ہونے والی تبدیلی نیز زندگی سے متعلق اس کے نظریات کی گرمی کو محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح مکان دنیائے فکشن میں ہی نہیں انسانی اذہان کی تاریخ کا ایک نیا تناظر لے کر ہمارے سامنے آتا ہے یہاں انسان تنہا اور منہ بسورتا سا محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر کچھ ابھرتا ہوا محسوس کرتا ہوا اور اپنے چھوٹے چھوٹے مقاصد سے پرے ایک عظیم انسانی آزادی اور اس کے اقدار کی بازیافت کی طرف سفر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بلا مبالغہ مکان اردو ناول کے معیار سازی میں اہم کردار ادا کرنے والا رجحان ساز ناول ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

مختصر یہ کہ پیغام آفاقی نے اس ناول مکان میں شہر کی بے روح زندگی سماجی بے راہ روی اخلاقی زوال اقتصادی بدعنوانی جنسی پامالی ظلم و استحصال اور سیاسی جبر وغیرہ کو خوبصورتی سے اپنے تخلیقی سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ موضوع اور قصہ کی مناسبت سے کرداروں کی پیشکش کی ہے۔ تمام کردار خواہ مرکزی ہوں یا ذیلی سبھی اپنی جگہ پرفٹ نظر آتے ہیں۔ سبھی اپنی شخصیت کی مناسبت سے زبان کی ادائیگی میں بھی ماہر ہیں۔ لہذا یہ کہا جائے گا کہ ان کرداروں کے ذریعہ آفاقی نے جدید زندگی کی زوال پذیر اخلاقی قدریں بے چہرگی لاقانونیت انتشار بدامنی اور خوف وغیرہ کو سامنے لایا ہے۔ پورا ناول حق و باطل کی جنگ کو اجاگر کرتا ہے یہ تمام کردار اس کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔

Dr. Ejaz Ahmad
Asstt. Professor
(Guest Faculty)
Deptt. of Urdu
H. P. S. College
Madhepur
Madhubani (Bihar)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد طارق

غالبؔ کے اردو قصائد

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب اردو ادب کی ایک قادرالکلام اور عالمگیر شخصیت کا نام ہے۔ غالب کا فطری مذاق سخن غزل ہے۔ وہ غزل کی زلف گرہ گیر کے کچھ ایسے اسیر ہوئے کہ دوسری اصناف سخن کی طرف کم ہی متوجہ ہوئے۔ غزل میں ان کا نیا، منفرد اور اچھوتا انداز بیان انہیں خود دوسرے غزل گوشعرا سے امتیازی حیثیت بخشتا ہے۔ خطوط کے میدان میں بھی وہ اپنے لب و لہجے کے تنہا نظر آتے ہیں۔ یوں ہی قصائد کے حوالے سے بھی ان کا رنگ رنگِ بے مثل اور انداز قصیدہ گوئی یکتا و یگانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی کے اس طرز بیان کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔

اردو ادب میں قصائد کے حوالے سے غالب کی کل کائنات ان کے چار قصائد ہیں۔ دو حضرت علیؓ کی شان میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں۔ لیکن غالب کے چاروں قصائد قصیدہ نگاری کے افق پر اپنی تابانی و درخشانی کے باعث دور سے دیکھے اور پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ چار ایسے ستارے ہیں جس نے دوسرے ستاروں کو تو اپنی روشنی تقسیم کی ہے لیکن کسی سورج سے کسی قسم کی کوئی روشنی کشید نہیں کی ہے۔ ذوق اور سودا نے اگر چہ کثرت سے قصائد کہے ہیں اور یقیناً ان کا مرتبہ قصیدہ گوئی کے حوالے سے انتہائی بلند ہے اور غالب کے قصائد ان کے قصائد کے سامنے اتنے بلند اور اس پائے کے نہیں ہیں، لیکن ان کی انفرادیت ضرور مسلم ہے۔

دیوان غالب میں شامل پہلا قصیدہ 'ساز یک ذرہ نہیں، فیض چمن سے بیکار'، حضرت علیؓ کی شان میں ہے۔ قصیدے میں طوالت نہیں ہے، مختصر ہے۔ گیارہ اشعار پر مشتمل تشبیب میں مرزا غالب نے موسم بہار کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ وہ بہار کی کوئی زندہ تصویر اپنی تشبیب میں پیش نہیں کر سکے۔ تشبیب میں بہار کے متعلق خیالات کا بکھراؤ ہے۔ تراکیب فارسی زدہ ہیں اور کہیں کہیں تعقید جیسے نقائص بھی در آئے ہیں۔ قصیدے میں شامل گریز کا شعر بہت عمدہ اور کمال کا ہے۔ کہتے ہیں۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار سے پیدا منقار

یعنی سبزۂ کہسار ایک سبز طوطے کی مانند ہے۔ اس کی سرخ چونچ لعل سے مشابہ ہے۔ اور وہ سرخ چونچ والا سبز طوطا میرے آقا کی مدح سرائی کے لیے تخلیق ہوا ہے۔ قصیدے کے اس حصے میں غالب نے اپنی سخن گوئی کے جوہر دکھائے ہیں۔ عمدہ اور دلکش تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ چشمِ جبریل کو قالبِ خشت دیوار کہنا، عرش کا مزدور کے کاندھے کے مثل جھکنا، فیض خدا کو معمار کی رسی ذکر کرنا، آئینہ خانہ سے چشمِ مشتاق مراد لینا اور تاروں کو مہِ نو کے آنسو بتانا، جیسی نادر تشبیہات و استعارات مرزا غالب کی قادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ قصیدہ غالب کے اس دور سے متعلق ہے جب مشکل پسندی اور فارسی آمیز تراکیب ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسی لیے یہ قصیدہ قاری پر اپنا کوئی خاص رنگ نہیں چھوڑ پاتا اور قاری اسکی فارسی زدہ تراکیب اور غرائبات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

دیوان غالب میں شامل دوسرا قصیدہ، 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں' بھی علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔ اس کی تشبیب تصوف سے متعلق ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود کی تائید کرتے ہوئے کثرت کا انکار اور دنیا داری سے بے رغبتی کا درس دیا گیا ہے۔ یہ تشبیب پہلے قصیدے میں شامل تشبیب سے ہر اعتبار سے بلند ہے۔ میرے مطابق اس قصیدے میں مرزا نے تشبیب سے مدح کی طرف آنے کے لئے دو اشعار کا استعمال کیا ہے۔ دونوں اشعار روایتی قسم کے ہیں۔ البتہ روایتی ہوتے ہوئے بھی ایک دم نئے اور پر لطف معلوم ہوتے ہیں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواسِ قریں

آپ تصور کیجیے کہ جب کسی بزرگ کے سامنے دنیاداری اور خدا سے بے رغبتی کی باتیں کی جاتی ہیں تو وہ کس قدر دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھ کر اللہ توبہ! اللہ توبہ! کرتا ہے اور لوگوں کو لاحول پڑھنے کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ کی پناہ مانگنے کا مشورہ دیتا ہے۔ بالکل ٹھیک اسی طرح جب غالب دامِ تشبیب میں الجھ جاتے ہیں تو ان کا ضمیر جھنجھوڑتا ہے ''کیا بکواس کرتا ہے؟ اللہ کی پناہ حاصل کر، آداب کو ملحوظ رکھ اور لاحول پڑھ کر یا علی کا وظیفہ کر۔

مدح کا حصہ یوں شروع کرتے ہیں جیسے کوئی واعظ اپنے وعظ کی کی تمہید باندھتے ہوئے اپنے ممدوح کے نسب اور تعلق کا فخریہ اظہار کرتا ہے۔

مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسل
قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد یقیں

مدح کے اس حصے میں ممدوح کے اخلاق، شجاعت و فضیلت، عدل و انصاف نیز تلوار اور سواری کا

تذکرہ کیا ہے۔ یہاں غالب کی بلند خیالی، دقت نظری اور ندرت خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختصار اور جامعیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کلام کی طوالت سے دامن کو بچاتے ہوئے ہوئے مکمل مضمون کو ایک شعر یا ایک ایک مصرعے میں سمو دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا   وہ کفِ خاک ہے ناموس دو عالم کی امیں
نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے   ابداً پشت فلک خم شدۂ ناز زمیں
برش تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا   قطع ہو جائے نہ سرِ رشتۂ ایجاد کہیں
جسم اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر   نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

مدح میں غالب اپنی کمال شان وشوکت کے ساتھ تب نظر آتے ہیں جب وہ مدح میں استفہام انکاری کا استخدام کرتے ہوئے اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہیں۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟   شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا؟   کس سے ہو سکتی ہے آرایش فردوس بریں؟

یعنی خدا کے بغیر کسی سے تیری تعریف ممکن نہیں ہے۔ شعلۂ شمع کا ہی شمع کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ ہی فقط جانتا ہے کہ تیری شان وشوکت کیا ہے۔ اور خدا کے ممدوح کی تعریف وتوصیف کوئی بیان نہیں کر سکتا جیسے کہ آرائش فردوس بریں خدا کے علاوہ کسی کے لیے ممکن نہیں۔

دعا کے اشعار قصیدے کے موضوع سے ہم آہنگ ہیں۔ دعا میں انفرادیت بھی ہے۔ دعا اور مدح کے درمیان ایک توازن اور تعلق رکھا گیا ہے۔ دعا میں غم شبیر اور الفت شبیر کو مانگا گیا ہے۔ شبیر، جو علی علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں، ان کے گھوڑے دلدل کی محبت کا سوال کیا گیا ہے۔ اس طرح مدح و دعا میں اک ربط پیدا ہو گیا ہے۔

یہ قصیدہ روانگی، سلاست اور برجستگی کے لحاظ سے پہلے قصیدے سے زیادہ معتبر ہے۔

غالب کے باقی دو قصیدے بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ہیں۔ پہلے قصیدے کی تشبیب نہایت اعلیٰ ہے۔ تشبیب میں مہِ نو سے مکالماتی انداز اور سوال و جواب جیسا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس تشبیب کا مطالعہ کرتے وقت غالب کے خطوط کا خیال آنا ناگزیر ہے۔ وہی خیال کی ندرت، وہی جدتِ اندازِ بیان اور وہی بے تکلفی جو ان کے خطوط کا خاصہ ہے، یہاں نظر آتی ہے۔ بس فرق شعر و نثر کا ہے۔ تشبیب کا انداز کچھ ایسا ہے کہ سامع بے قرار ہو جاتا ہے کہ شاعر کس کے بارے میں بات کر رہا ہے اور کیا بات کر رہا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سماج میں جب دو لوگ گفتگو کرتے ہیں اور تیسرا شخص اس جستجو میں ہو کہ کس کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ غالب سامع کی بے قراری کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ممدوح کو واحد غائب کے صیغۂ

ISSN : 2582 - 3612

راز میں رکھتے ہیں۔ تشبیب دیکھیں۔

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اس کا نام   جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح   یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب   ''بندہ عاجز ہے گردش ایام''
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا   آسماں نے بچھا رکھا تھا دام مختصراً
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش   غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام

اس قصیدے میں تشبیب کے ساتھ مدح کو غالب نے اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ ہم اسے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ یہاں غالب کا فن اپنی معراج پر نظر آتا ہے اور قصیدہ گوئی میں ان کی انفرادیت بالکل روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ تشبیب اور مدح کے مضامین کے بعد غالب کا قلم غزل کی طرف آتا ہے۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار میں وہی انداز بیان اور وہی لطافت ہے جو غالب کی غزلیہ شاعری کا خاصہ ہے۔ غزل میں شراب، بوسہ، کعبہ، ناقوس، احرام، دیر، جیسے استعارات کے ذریعے قصیدے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ یہاں جدت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ چند شعر۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟   غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام
بوسا دینے میں ان کو ہے انکار   دل کو لینے میں جن کو تھا اِبرام

یہاں پہنچ کر غالب کو خیال آتا ہے کہ اس کا قلم کسی اور مقصد سے اٹھا تھا اور اب کہیں اور جا نکلا ہے۔ اور پھر برجستہ یہ شعر آتا ہے جو گریز کا ہے۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

یعنی میں نے تو سب کچھ کہہ دیا اب تو بتا کہ چاند وسورج اور زہرہ ومریخ کس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ مہِ نو کو خاموش دیکھ کر غالب قصیدے کو مدح کے ذریعہ یوں آگے بڑھاتے ہیں۔

تُو نہیں جانتا تو مجھ سے سن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ   مظہرِ ذو الجلال و الا کرام

یہاں بھی علی علیہ السلام کی شان میں لکھے گئے قصیدۂ دوم کی مثل مدح کی ابتدا کی گئی ہے۔ ویسے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہی جیسے کوئی واعظ وعظ کہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے الفاظ وتراکیب کے ذریعہ تمہید باندھ رہا ہو۔ البتہ ان الفاظ وتراکیب میں شان وشکوہ وہی قصیدے کا ہے۔ مدح کی ابتدا مدحِ غائب کے طور پر ہوتی ہے اور چند اشعار کے بعد مدحِ حاضر میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

یہاں بہادر شاہ ظفر کے عدل وانصاف، شجاعت و بہادری، تیرو تیغ، ہاتھی گھوڑے اور دوسرے خصائل کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ مدح کا میدان غالب کے لئے تنگ نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی خودداری اور اختصار پسندی ہے۔ غالب نے بہادر شاہ ظفر کے جن متعلقات ومنسلکات کا تذکرہ کیا ہے، یہ کوئی نیا نہیں ہے۔ تمام قصیدہ نگاروں کے قصیدے انہی اوصاف کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ البتہ غالب کا انداز بیان بہت مختلف ہے۔ اس میں جدت بھی ہے اور اختصار و جامعیت کے ساتھ انفرادیت بھی۔ مدح میں مبالغہ آمیزی بھی پر لطف ہے۔ حقیقت سے پرے ہے، لیکن قاری کے لئے مسحور کن ہے۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبان ِقیصر و جم   رزم میں اوستادِ رستم و سام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم   جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
مرحبا مو شگافیِ ناوک   آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ،ہدف   تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا   تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

قصیدے کی دعا بھی یک دم نادر اور جامع ہے۔ اور غالب دو مصروں میں بہت وسیع مفہوم کو آسانی سے ادا کرجاتے ہیں۔

ہے ازل سے روانیِ آغاز   ہو ابد تک رسائیِ انجام

غالب کا آخری قصیدہ بھی بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شان میں کہے گئے مذکورہ بالا قصیدے اور زیرِ ذکر قصیدے میں بہت مماثلت ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں قصیدے ایک ہی شخص کی تعریف میں ہیں اور دوسری یہ کہ یہ دونوں قصائد غالب کے دوسرے دور سے متعلق ہیں، جب غالب اپنے مخلص رفقاء کی فرمائش پر مشکل گوئی ترک کرچکے تھے اور اس ڈگر پر آچکے تھے، جس کے لیے غالب، غالب ہیں۔

قصیدے کی تشبیب سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قصیدہ انتہائی سلیس ہے اور برجستہ کہا گیا ہے۔ تصنع وتکلف نام کو بھی نہیں ہے۔ پہلے دو قصائد کے برخلاف فارسی زدہ تراکیب اور مشکل گوئی سے بھی پاک

ISSN : 2582 - 3612

ہے۔ کہتے ہیں۔

صبحِ دم دروازۂ خاور کھلا   مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا سی نمود   صبح کو رازِ مہِ اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ ، نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

تشبیب میں طلوعِ صبح کا بیان ہے اور اس طلوع صبح کے پس منظر میں بہادر شاہ ظفر کا دربار ہے۔ چونکہ ان کے ممدوح ظفر کے دربار کا انعقاد صبح میں ہوا تھا اور اس پس منظر میں قصیدے کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

حصۂ مدح کے درمیان غزل کے اشعار بھی ہیں۔ غزل میں غالب نے محبت، محبوب اور محبوب کی جفا کاری کا بیان بڑے انوکھے اور لطیف پیرائے میں کیا ہے۔ غزل میں شامل یہ شعر واقعی بہت عمدہ اور قابل داد ہے۔ کہتے ہیں۔

نا مہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دوسرا مصرع غزل کی جان سمجھ لیجئے۔ اس مصرع کو پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں غالب ایک مصور کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور یہاں ردیف 'کھلا' کا استعمال بھی بہت ہی لطیف اور قابل داد ہے۔

مدح کا مقام بہت بلند اور پہلے قصیدے کے قائم مقام ہے، لیکن یہ مدح پہلے قصیدے میں شامل مدح سے بہت منفرد اور الگ ہے۔ یہاں غالب گھوڑے، ہاتھی، تیرو تیغ، شجاعت وسخاوت اور عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ نئے تعریفی وتوصیفی زاویے کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق: اسرار کائنات ان کے ممدوح پر آشکار ہیں، اس کی تاویلات سے احکام شریعت کی وضاحت ہوئی، قیصر اور دارا جیسے اشخاص اسکے درباری ہیں، اس کا علم لہرانے سے سورج کانپتا اور فلک چکر کھاتا ہے، مسجد میں ممبر پر جب خطیب ممدوح کا نام لیتا ہے تب ممبر کی بلندی آشکار ہوتی ہے، سونے کا سکہ اس لیے قیمتی ہے کہ اس پر ممدوح کا نام ہے اور سب سے بڑی اور لطف کی بات تو یہ کہ خود غالب کی تعلیم وتربیت بھی بادشاہ یعنی انکے ممدوح کی مرہون منت ہے اور اسی کے باعث ان کا علم عظمت کا حامل ہوا ہے۔

مدح میں غالب نے انتہائی رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کتنے کمزور اور برائے نام بادشاہ تھے۔ بادشاہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایۂ ممبر کھلا الی آخر

لیکن غالب کی یہ مبالغہ آرائی ان کے بیانیہ حسن اور نادرانہ بیان کی تہوں میں کہیں چھپ سی جاتی ہے۔اس قصیدے کا خاتمہ بھی اپنی نوعیت کا ہے اور مدح وتشبیب اور خاتمہ کے درمیان ایک ربط بنائے ہوئے ہے۔

تم کرو صاحبِقرانی جب تلک ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

بالآخر اپنی بات علامہ اقبال کے ان ابیات پر ختم کرر ہاہوں۔

Mohd. Tariq
Assistant Professor (AC)
Uttarakhand Open University
Haldwani, Nainital
Uttarakhand

ڈاکٹر محمد حذیفہ

پروفیسر منظر حسین کی آزادشناسی

(مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی، ادبی، قومی وملی خدمات کی روشنی میں)

یہ بات بلاخوف تامل کہی جاسکتی ہے کہ ریاست جھارکھنڈ کے جس ادیب نے ایک مستند محقق، معتبر ناقد، ماہر اقبالیات اور ماہر آزادیات کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔بلا مبالغہ اس شخصیت کا نام پروفیسر منظر حسین ہے۔آپ کی علمی وادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔اب تک ایک درجن سے زیادہ مطبوعات منظر عام پر آکر ارباب نقدوفن سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں۔اوراس پر طرہ یہ کے مسلسل ان کی بے باک تنقیدی تحریریں ہنداور بیرونِ ہند کے جرائد ورسائل میں، کتابوں میں، خصوصی نمبرات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔اب تک سینکڑوں کی تعداد میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے موصوف نہ صرف ریاست جھارکھنڈ میں بلکہ پورے ہندوستان میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں اوراب تو عالمی منظر نامے میں بھی پروفیسر منظر حسین کی گونج سنائی دے رہی ہے۔کئی واقعات اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ایک واضح ثبوت تو یہ ہے کہ جب 2014ء میں آپ فریضہ حج کے لئے گئےتو حج سے فراغت کے بعد جدہ کی ادبی تنظیم اردو اکیڈمی، جدہ نے آپ کو مدعو کیا۔اس موقع سے ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔وہاں موصوف کا خصوصی لیکچر بھی ہوا۔اور پھر اکیڈمی نے آپ کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو اعزازی سند سے نوازا۔ابھی حالیہ دنوں میں اقبال اکیڈمی، لاہور نے ایک بین الاقوامی ویبینار کا انعقاد کیا تھا۔جس میں پروفیسر حسین نے "ہندوستان میں اقبالیات" کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کیا۔اور لیکچر کے کئی سیریز آن لائن نشر ہوئے۔اس کے علاوہ سیالکوٹ یونی ورسٹی، پاکستان کے اقبال چیر نے اپنے تحقیقی مجلّہ "اقبال" کی مجلس مشاورت میں "پروفیسر منظر حسین کو شامل کر کے اعزاز بخشا ہے۔اس طرح کے کئی واقعات اور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔

قومی سطح کی بات کریں تو پروفیسر منظر حسین شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں درجنوں اعزازات اور ایوارڈز مل چکے ہیں۔ 2013 میں ایکبڑا ایوارڈ'' جھا

رکھنڈ کا جینیس ادیب'' کا ایوارڈ بدست گورنر جھارکھنڈ ڈاکٹر سید احمد کے عطا ہوا، اور اکیاون ہزار روپۓ کی اعزازی رقم بھی عنایت کی گئی۔ ابھی ستمبر 2021 میں J.P.S.C نے ایسوسی ایٹ پروفیسر سے ''پروفیسر'' کے عہدے پر فائز کیا ہے۔ سردست اس مقالے میں جس کتاب کا تجزیہ وتنقید مقصود ہے اس کتاب پر گزشتہ سال مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے پہلا تحقیقی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ بہرحال یہ باتیں بر سبیل تذکرہ آگئیں۔ میری گفتگو کا موضوع پروفیسر منظر حسین کی آزاد شناسی ہے۔ لہٰذا اسی موضوع کے تحت میں اپنی باتوں کو مختص رکھوں گا۔

میرے پیش نظر پروفیسر منظر حسین کی مستند تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی، ادبی، قومی وملی خدمات'' (قیامِ رانچی کے حوالے سے) ہے۔ جو 256 صفحات پر مشتمل ہے 2017 میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ کتاب کے مشمولات میں ''حرفِ چند'' کے علاوہ پانچ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون ''مولانا آزاد اور رانچی،، کے عنوان سے ہے۔ دوسرا مضمون مولانا آزاد کی شاہ کار تصنیف ''تذکرہ،، پر مختص ہے۔ تیسرے مضمون میں ''ترجمان القرآن،، کے حوالے سے مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت پر گفتگو کی گئی ہے۔ جبکہ چوتھے مضمون میں ''جامع الشواہد،، کو بنیاد بنا کر مولانا کے فقہی بصیرت کو آشکار کیا گیا ہے۔ پانچواں اور آخری مضمون ''انجمن اسلامیہ اور مدرسہ اسلامیہ، رانچی کے قیام'' کے تعلق سے ہے۔

''حرف چند،، کے تحت پہلے مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے اوصاف وکمالات کا مختصراً تذکرہ ہے۔ اور پھر مولانا کی رانچی آمد اور اس کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ بعدازاں کتاب میں شامل مضامین کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ اور آخر میں اس تاسف کا اظہار کیا گیا ہے کہ قیامِ رانچی کے حوالے سے ایک اہم کڑی مولانا کے وہ خطوط بھی ہیں جو رانچی کے قیام کے دوران لکھے گئے تھے، ان خطوط کا تفصیلی ذکر ہونا چاہئے تھا مگر کتاب کی ضخامت کی وجہ سے اسے شاملِ کتاب نہیں کیا گیا۔ مصنف کا عزم ہے کہ بہت جلد ایک الگ کتاب ترتیب دے کر مولانا آزاد کے ان مکاتیب کا تفصیلی تذکرہ ہوگا۔ ''حرفِ چند،، کے آخر میں کتاب کی اشاعت کا جواز پیش کرتے ہوئے مصنف نے یوں تحریر کیا ہے :

''یہ کتاب رانچی میں مولانا کی آمد کے سوسال پورا ہونے پر انھیں خراجِ
عقیدت پیش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کو عام کرنے کے لئے
ایک علمی ضرورت کے تحت لکھی گئی۔،، [۱]

متذکرہ کتاب کا پہلا مضمون ''مولانا آزاد اور رانچی،، کے عنوان سے ہے۔ اس کے تحت پروفیسر منظر حسین نے قیام رانچی کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کے شب وروز اور ان کی عملی زندگی کا تفصیلی خاکہ کھینچا ہے۔ اس مضمون میں مولانا آزاد کی رانچی آمد اور اس کے وجوہات، نظر بندی کی آزمائش، مولانا کے قیام گاہ کی

ISSN : 2582 - 3612

تلاشی اور مسودات کی ضبطی، رمضان میں مولانا کے مشاغل، حکم جلاوطنی کی منسوخی لئے دوستوں اور قدردانوں کی کاوش، حوصلہ شکن حالات میں بھی جامع مسجد کو مرکز بنا کر مولانا کا دینی، قومی وملی کارہائے نمایاں انجام دینا، ایامِ اسیری میں بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ اور پھر ایامِ نظر بندی پر خود مولانا کے تاثرات اور دوسرے مضامین سب پر تفصیلی اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

مولانا کے رانچی آمد اور ان کی نظر بندی کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر منظر حسین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مولانا عزم وحوصلہ اور استقامت کے علم بردار تھے۔ نظر بندی خلوت گزینی اور نامساعد حالات میں بھی کام کرنے کا ہنر جانتے تھے۔

8 جولائی 1916ء کو جب نظر بندی کا فیصلہ ہو چکا، حکم جلاوطنی کی منسوخی کے لئے دوستوں اور قدردانوں کی کاوشیں بھی ناکام ہوگئیں تو مولانا نے اسی قید وبند میں کام کرنے کا عزم کرلیا اور ان کے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ :

''دنیا نے فراغ وآزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا
ہے۔ بہتر ہے کہ جلاوطنی ونظر بندی کے بند وقید میں کام کرنے کا بھی ایک
نمونہ دکھلایا جائے کہ اصل آزمائش گاہِ عمل یہی ہے'' [۲]

اور پھر مولانا نے جامع مسجد رانچی کے منبر ومحراب سے دعوت وارشاد کا کام شروع کر دیا لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کیا۔ انھیں حرکت وعمل پر آمادہ کیا۔ غرض مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لئے مولانا آزاد نے ہمہ جہت کوششیں کیں۔

مولانا آزاد کے رانچی کی زندگی کئی حیثیتوں سے بے حد اہم ہے کہ ایامِ نظر بندی میں جہاں ایک طرف مولانا نے قوم وملت کی فلاح و بہبود اور ملت کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے مسلسل مصروفِ عمل رہے تو دوسری طرف تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ قرآن پاک کی تفسیر ''ترجمان القرآن،، مولانا آزاد کی شاہ کار تصنیف ''تذکرہ،، اور رسالہ ''جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد،، رانچی کے دورِ نظر بندی کی ہی یادگاریں ہیں۔ جس پر تفصیلی گفتگو کتاب کے اگلے مضامین میں کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون مولانا آزاد کی شاہ کار تصنیف ''تذکرہ،، کے تعلق سے ہے جس کا عنوان ''تذکرہ،، مولانا آزاد کی علمی دانشوری کی شاہ کار تصنیف،، ہے۔ بظاہر یہ کتاب مولانا آزاد کے سوانحی واقعات اور ان کے اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ مگر اصل میں دعوت و اصلاح کا پیغام اس میں پنہاں ہیں۔

یہ کتاب ستمبر 1919ء میں البلاغ پرنٹنگ ہاؤس کلکتہ سے مولوی فضل الدین نے اپنے مقدمہ کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ساتھ شائع کیا۔ جس میں مولانا آزاد کے پردادا شاہ محمد افضل کے مادری سلسلہ کے ایک بزرگ صاحب طریقت شیخ جمال الدین دہلوی جو اپنی حق گوئی اور حق پرستی کے لئے مشہور تھے ان کو سرعنوان بنایا گیا ہے۔ بقول پروفیسر منظر حسین :

''تذکرہ،، دراصل ایک ایسی خودنوشت ہے جس میں مولانا آزاد نے حضرت مولانا جمال الدین کو سرعنوان بنا کر ایک سانچہ مرتب کیا ہے جس میں حق و صداقت کے پیامبروں جنہیں وہ اپنا ہیرو تسلیم کرتے تھے کی داستانِ حیات، باطل کے خلاف اثبات حق کے لئے ان کی مسلسل جدوجہد، سرفروشی و جاں سپاری کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مولانا نے اپنے عادات و خصائل اور فکر و نظر اور اظہار ذات کو بھی موضوع بنایا ہے جن کا خمیر نسل و خاندان کی مٹی سے تیار ہوا ہے۔،،[۳۴]

اس مضمون کے تحت پروفیسر منظر حسین نے مولوی فضل الدین کے مقدمہ کی اس تحریر کا بھی ذکر کیا ہے جو علامہ اقبال کی دل آزادی کا باعث بنی۔ لکھتے ہیں کہ ''وفور جذبات اور عقیدت سے مغلوب ہو کر مولوی فضل الدین نے مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے علمی مرتبے کو اجاگر کرنے کے چکر میں علامہ اقبال کے سلسلہ میں لکھ دیا کہ :

''ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اسرا خودی اور رموز بےخودی فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔''

(مقدمہ۔ تذکرہ)

علامہ اقبال مقدمے کی مذکورہ تحریر سے رنجیدہ ہو کر علامہ سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر شکایت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ مولوی فضل الدین لکھتے ہیں کہ ''اقبال کی مثنویاں الہلال کی بازگشت ہے'' اپنے مکتوب میں آگے تحریر کرتے ہیں :

'البتہ اس بات سے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کر دیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے: ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔،،

علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اس کا تذکرہ کیا تو مولانا آزاد کو بھی مذکورہ تحریر پر رنج ہوا اور انہوں نے علامہ اقبال کی شکایت کو حق بجانب قرار دیا۔ اور اپنے ایک مکتوب بنام سید سلیمان

ندوی یوں تحریر کیا ہے :

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں۔ تو کیا کیا جائے۔،،

(مکتوب بنام سید سلیمان ندوی۔ بابت ۔2 جنوری 1920ء)

مضمون کے اگلے حصے میں ''تذکرہ'' میں جن علماء کا خصوصی طور پر ذکر ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر مولانا آزاد نے علماء کے دو طبقے علماء حق، اور علماء سوء اور دونوں کے درمیان باہمی آویزش کو آشکار کیا ہے۔ پروفیسر منظر حسین نے اس پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں تذکرہ،، کی صنفی نوعیت پر بحث قائم کی گئی ہے۔

اسلوب نگارش کے حوالے سے مولانا آزاد کی مذکورہ تصنیف گوہر آبدار ہے مولانا کی قوتِ اظہار و بیاں کا ایک نمونہ ہے، علمی وقار و تمکنت کا ثبوت ہے ان کے زبان و قلم کی سحر انگیزیوں کا ترجمان ہے۔ بقول پروفیسر منظر حسین "تذکرہ محض ایک خودنوشت سوانح ہی نہیں بلکہ اسے ایک ایسا ادبی دستاویز کہا جائے جس میں مذہب، فلسفہ، سیاست، تاریخ، شخصیات کے علاوہ مختلف مسائل پر عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں خطیبانہ انداز بھی ہے اور شوکت الفاظ کا بحرِ ذخار بھی اور توارد، تکرار، ادعائی طرز تخاطب کی فراوانی بھی۔ مولانا آزاد کی شخصیت کی رنگارنگی ''تذکرہ،، کے اسلوب میں مضمر ہے۔،،

تیسرا مضمون ''ترجمان القرآن: قرآنی بصیرت کا ترجمان،، کے عنوان سے ہے اس مضمون میں اولاً لفظ ''تفسیر'' کی تعریف اور پھر تفسیر کی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعدازاں مولانا آزاد کی قرآنی فکر اور پھر ''ترجمان القرآن،، کی اشاعت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد کے دیباچے میں مولانا آزاد ترجمان القرآن کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے، یوں تحریر کرتے ہیں :

''مذہبی اصلاح کے لئے سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کی تعلیم و اشاعت کا سروسامان ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔۔۔۔ پھر ضروری تھا کہ ایک ایسی کتاب اردو میں تیار ہو جائے جس کی نسبت وثوق سے کہا جا سکے کہ اس کا پڑھ لینا قرآن کے مقاصد و مطالب سمجھ لینے اور اسے اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھ لینے کے لئے کافی ہے۔ وہ نہ تو اس قدر ضخیم ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعے کے لئے وقت نہ نکال سکے، نہ اس قدر مختصر ہو کے مطالب کی وضاحت تشنہ

رہ جائے۔ اس کی نوعیت ترجمہ ہی کی ہو، لیکن ایسا ترجمہ کہ اپنی وضاحت
میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو۔'' [4]

یوں تو ایک عرصے سے مولانا آزاد قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کے لئے کوشاں تھے لیکن یہ موقع انھیں رانچی میں میسر ہوا۔ جب رانچی تشریف لائے تو چند کتابیں اور مسودات بھی ساتھ لائے تھے، ابھی تین ماہ گزرے ہی تھے اور آٹھ پاروں تک ترجمہ اور سورۃ النساء تک تفسیر لکھ چکے تھے کہ حکومت ہند کے محکمۂ تفتیش کا افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ رانچی پہونچا اور مکان کی دوبارہ تلاشی لی اور تمام کتابیں ومسودات ضبط کر لئے۔ اس واقعہ سے مولانا دلبرداشتہ تو ضرور ہوئے۔ مگر ہمت واستقلال کا دامن نہ چھوڑے۔ نویں پارہ سے پھر ترجمہ شروع کر دیا۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ مخالف حالات کے باوجود 1918 میں ترجمہ کا کام مکمل کر لیا۔ دوسری طرف وہ آٹھ پاروں کا ترجمہ جو محکمۂ تفتیش نے ضبط کیا تھا۔ خط وکتابت کے ذریعہ واپسی کی کوشش کی گئی مگر حکومت نے واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بالآخر مجبور ہو کر مولانا نے ازسرنو آٹھ پاروں کا ترجمہ کیا۔ یہ رانچی اور اہل رانچی کے لئے باعثِ فخر ہے کہ اللہ نے مصحفِ آسمانی کا ترجمہ مولانا آزاد کے ہاتھوں سرزمینِ رانچی میں کروایا۔

مضمون میں پروفیسر منظر حسین نے ترجمان القرآن کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک واقعۂ پرسوز کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ یہ کہ 1921 میں جب ملک میں تحریک عدم تعاون کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھی۔ مولانا آزاد بھی پیش پیش تھے۔ جولائی 1921ء کو مرزاپور میں عدم تعاون کے تعلق مولانا کی پرجوش تقریر ہوئی تھی جس کے پاداش میں حکومت نے انہیں ان کے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ اور ستم یہ کہ گرفتاری کے بعد مولانا کے گھر اور پریس کی تلاشی لی گئی۔ دوسرے کاغذات کے ساتھ ترجمان القرآن کی کتابت شدہ کاپیوں کو بھی پولس اپنے ساتھ لے گئی۔ اور پھر بڑی کوشش کے بعد کاغذات ومسدات واپس تو ملے مگر بقول مولانا آزاد "اوراقِ پریشاں کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے۔ یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔،، مولانا کے لئے یہ آزمائش بڑی تلخ تھی۔ اس واقعہ سے انھیں بہت اذیت پہنچی تھے۔ لکھتے ہیں :

"....... یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے
لبوں کو لگایا۔ لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا، البتہ اس سے انکار
نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے۔،،
(ترجمان القرآن۔ص۔210)

سیاسی زندگی کی شورشوں سے مولانا آزاد تنگ آ چکے تھے۔ مگر اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لئے حتی

ISSN : 2582 - 3612

الوسع کوشش کرتے رہے بالآخر 1930ء میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورۃ نساء تک محیط تھی شائع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد 1936ء میں دوسری جلد بھی شائع ہوئی جو سورۃ مئومنون تک ترجمہ اور تفسیری نوٹ پر مبنی تھی۔ مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ تیسری جلد بھی جلد شائع ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مولانا کے انتقال کے بعد مولانا غلام رسول مہر نے بقیہ پاروں کی تشریح وترجمہ '' باقیات ترجمان القرآن'' کے عنوان سے جو مولانا کی مختلف تحریروں میں بکھری پڑی تھیں ان کو جمع کر کے شائع کروایا۔

مضمون کے اگلے حصے میں ڈاکٹر منظر حسین نے ذیلی عنوانات کے تحت خصوصاً,, فقہی آیات کی تفسیر میں مولانا کی انفرادیت ،،اور'' تاریخی واقعات کی تفسیر وتوضیح میں مولانا آزاد کی انفرادیت'' میں جو علمی مباحث قائم کئے ہیں اور جس انداز سے مولانا کی قرآن فہمی اور فقہی جزئیات کو اجاگر کیا ہے وہ آپ کی علمی بصیرت اور تفسیری وفقہی علوم پر مہارت کا پتہ دیتی ہے۔

فقہ کے سلسلے میں مولانا کا موقف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر منظر حسین نے بطور نمونہ چند فقہی مسائل مثلاً ''امارت کا مسلئہ، زکواۃ کے مصارف، مال و دولت کی تقسیم، عورتوں کے حقوق، نسخ کا معاملہ، ازدواجی تعلقات، جیسے اہم مسائل پر بھی گفتگو کی ہے جس پر مولانا نے ترجمان القرآن میں بحث کی ہے۔

تاریخی واقعات کی تفسیر وتوضیح میں بھی مولانا آزاد اپنی انفرادیت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر منظر حسین نے سوہ کہف اور اس کی تفسیری مباحث میں محققین کا خیال اور مولانا آزاد کی نادر تحقیقات کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے اور یہ مغز ابھارنے کی کوشش کی ہے :

" تاریخی واقعات کی تفسیر میں توضیح وتشریح اور تحقیقی موشگافیوں سے جو استناد
مولانا آزاد نے بخشی ہے وہ ان کے وسعت مطالعہ، قوت استدلال اور لہجہ
کے اعتماد کا ضامن ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں اصحاب کہف کے سلسلے میں نادر
تحقیقات ان کی علمی کاوشوں کا شاہ کار ہے۔'' [5]

کتاب کا چوتھا مضمون جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد: مولانا آزاد کی فقہی بصیرت کا شاہ کار،، کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں پہلے مذکورہ رسالے کی تالیف کا پس منظر اور محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخی وسیاسی پس منظر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انگریزی حکومت نے 1919ء میں رولٹ ایکٹ جیسا سیاہ قانون نافذ کیا تو پورے ملک میں اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔ تمام احتجاجی کاروائیاں پرامن طریقہ سے چل رہی تھی مگر پولس نے ایک بہانہ بنا کر احتجاجیوں کو حراست میں لینا شروع کر دیا جس کے ردعمل پر بھیڑ مشتعل ہو گئی تو فوج نے گولی چلا دی جس میں پانچ ہندوستانی شہید ہو گئے۔ اس واقعہ سے پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ملک کے مختلف خطوں میں شہیدوں کی یاد میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔4اپریل1919ءکوجامع مسجد دہلی میں بھی 30 مارچ کوشہید ہونے والوں کوخراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں سوامی شردھانند بھی شریک ہوئے اور مسجد کے صحن میں مکبر کے چبوترے پر کھڑے ہوکرلوگوں کوخطاب کیا۔مگر مسلمانوں کا ایک طبقہ سوامی جی کے مسجد میں داخلے اورتقریر پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس فعل کونہ صرف ناجائز بتایا بلکہ ایک سخت فتنہ وبدعت سے تعبیر کیا۔اورکہا کہ اس سے مسجد کی توہین ہوئی ہے۔

پروفیسر منظرحسین نے اپنے اس مضمون میں جامع الشواہد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مذکورہ مسئلے میں تمام دلائل عمل صحابہ،قول ائمہ اربعہ وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مولانا آزاد کی فقہی بصیرت کو آشکار کیا ہے اورآخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ :

> ''جامع الشواہد فی دخول غیرالمسلم فی المساجد،، مولانا آزاد کی وہ تصنیف ہے جس میں فقہی مباحث بیان کئے گئے ہیں۔کتاب کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا فقہی منہاج مجتہدانہ ہے۔وہ اپنی باتوں کوتقویت بخشنے کے لئے مجموعی اسلامی فقہ کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔جامع الشواہد کے مطالعے سے مولانا کے ذوق وذہین،فقہ پر ان کا وسیع مطالعہ،اجتہادی بصیرت،دلائل کا استنباط اورفقہی مستدلات کا پتہ تو چلتا ہی ہے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کے لئے وہ کس قدر کوشاں تھے اس کا اعتراف مولانا کی مخالفین نے بھی کیا ہے۔'' ۶

کتاب کا پانچواں اورآخری مضمون ''انجمن اسلامیہ کی تشکیل اورمدرسہ اسلامیہ کے قیام'' کے تعلق سے ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر منظرحسین نے مولانا آزاد کی رانچی میں تنظیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔مولانا آزاد جب رانچی آئے تھے تو یہاں کے مسلمانوں کونہایت ذلت کی حالت میں دیکھا تھا۔ مسلمان تعلیمی،معاشی،سماجی ہراعتبار سے پسماندگی کے شکار تھے،مذہبی احساسات کی روح ان کے اندر سے مردہ ہوچکی تھی،چاروں طرف عیسائی مشنریوں نے جال پھیلا رکھا تھا،اورمسلمانوں میں اتحادواتفاق نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔اس مشاہدے نے مولانا کیے حساس اوردرمند دل کو بے چین کردیا۔انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی اصلاح تعلیمی فروغ اوراجتماعی نظام کی درستگی کے بغیرممکن نہیں۔لہذا اس مقصد کے پیش نظر مولانا نے پہلے 15 اگست 1917ءکورانچی کے مسلمانوں کی ایک متحدہ کمیٹی بنام "انجمن اسلامیہ،، کی تشکیل دی،اورپھراسی انجمن کے زیراہتمام 24 فروری 1918ءکومدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔انجمن اور مدرسہ کی عمارت کی تعمیر کے لئے اپنے دوستوں اورعقیدت مندوں سے چندہ جمع کیا خود اپنا ذاتی رقم بھی

صرف کیا۔اورپھرانجمن کے زیراہتمام سالانہ جلسے منعقد کئے اوران جلسوں میں ملک کے مقتدر شخصیتوں کو مدعوکیا اورایک علمی فضا ہموار کی،گویا ایک سرزمین بے چراغ کوروشن کرنے کی سعئ مستحسن کی۔

پروفیسر منظرحسین نے اپنی مذکورہ کتاب میں مولانا آزد کی رانچی میں دورنظر بندی کے شب وروز اوران کی عملی زندگی کے احوال وکوائف کومعتبر اورمستند حوالوں کے ذریعے اس تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ رانچی کے تعلق سے مولانا کی شخصیت اوران کے کارناموں کے تقریباً تمام پہلو روشن ہو گئے ہیں اور انکشافات کے نئے نئے دریچے واہوئے ہیں۔

یوں تو مولانا آزاد کے قیام رانچی کے حوالے سے مختلف رسالوں میں،کتابوں میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں،مگر ہرجا اختصار واجمال اورتشنگی کا احساس ہوتا ہے۔زیرتبصرہ کتاب اپنی تفصیل اور جامعیت کے اعتبار سے تحقیقی کارنامہ سے کم نہیں۔کتاب کے مشمولات پرنظرڈالئے تو بخوبی احساس ہوگا کہ مصنف نے بڑی جانفشانی اورعرق ریزی کے ساتھ کمال تحقیق کا مظاہرہ کیا ہے۔مولانا کی شخصیت اوران کے کارناموں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی،تفسیری وفقہی بصیرت کوبھی جس انداز میں آشکار کیا گیا ہے وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ مصنف کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔اورانہوں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ تحقیقی امورکوانجام دیا ہے۔ان کی تحریر میں ضبط واعتماد کی کیفیت ہے،لہجے میں توازن ہے،انداز بیان محققانہ ہے،جوسنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے۔لہٰذا بڑے وثوق کے ساتھ میں یہ کہ سکتا ہوں کہ پروفیسر منظر حسین کی یہ تحقیقی کاوش آزادیات کی تفہیم میں ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

حواشی:

۱۔ ''مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی،ادبی،قومی وملی خدمات''(قیام رانچی کے حوالے سے) حرفے چند۔ڈاکٹر منظرحسین۔صفحہ۔۱۳

۲۔ ''تذکرہ''۔مالک رام صفحہ۳۳۶

۴۔ ''مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی،ادبی،قومی وملی خدمات''(قیام رانچی کے حوالے سے) صفحہ۶۳

۶۔ ''ترجمان القرآن''(جلداول)۔دیباچہ۔ صفحہ۹۔۷

۸۔ ایضاً صفحہ۱۶۶ ۹۔ ایضاً صفحہ۲۱۳۔۲۱۲

Dr. Md. Huzaifa
Department of Urdu
Mandarcollege,Mandar,Ranchi,
(Jharkhand)
Mob-6202272692

ڈاکٹر مسرور صغریٰ

غروبِ کرب وطلوعِ نشاط کا شاعر: افتخار عارف

افتخار عارف جیسے حق پرست شاعر نے اس دنیائے سحر آگیں میں 21 مارچ 1944 کو سرزمین لکھنئو میں اپنی زیست کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے روتے روتے آنکھیں کھولیں گویا انہیں پیدا ہوتے ہی خداوندمتعال نے ازل سے رموز زیست کی معرفت عطا کردی ہو لہذا والدین نے بڑی محبت سے ان کا نام افتخار حسین عارف رکھا اور پھر عرفان بقائے زیست ومعرفت علم وشریعت کی معراج پہ پہونچتے پہونچتے اس مقام تک رسائی حاصل کی جہاں ان کی شخصیت کسی بھی تعارف کی محتاج نہ رہی ، ادب کے سکڑوں درخشاں باب مزین ہیں۔افتخار عارف کے شعری محاسن سے ان کے بحر اشعار کا ہر موتی گہر، ہر احساس سحر بن کر اہل ذوق کے دل کی گہرائیوں میں سرعت سے پھیلتا چلا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ مضبوط وتوانا درخت کی خوشنما وخوشبودار شاخوں کی مانند اپنے نایاب وجود کی بقا کے لئے راہیں خود ہموار کرلیتا ہے اور دائمی نمو وبالیدگی کے تمام اسباب اپنی رعنائیوں ودلکشی کے باعث مسلسل ہر آنے جانے والی سانسوں میں نشاط و مسرت کا پیغامبر بن کر کشید کرتا رہتا ہے۔

افتخار عارف کی شاعری ایک درخشندہ ستارے کی مثل عرصے سے سرزمین ادب میں ضیا پاشیاں کر رہی ہے اور اس کی ضیا اس کی تابانی تمام ساکنان صحن ادب وفن کے شعور واذہان کو روشن کئے ہوئے ہے اور کہیں سنبل تو کہیں یاسمن بن کر گلستان ادب کو مہکا رہی ہے اور اس کی دلفریب رنگت واس کی حنائی خوشبو سے فقط شعور وفکر ہی نہیں بلکہ روح تک معطر وسرشار ہو اٹھتی ہے۔ان کی شاعری کبھی سماعتوں کو کبھی بصارتوں کے وسیلے سے ہمارے اعصاب کے خوابیدہ کمزور ولاغر دریچوں تک پہونچ کر اس کی ہر بند گرہیں کھولتی چلی جاتی ہے اور یکا یک ہمارے کئی مسائل جو لاشعوری طور پر کسی سنگ گراں بار کی شکل اختیار کر چکے ہوتے ہیں سد باب تلاش کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ساری گرہیں کشا ہو جاتی ہیں اور زندگی کے کئی دقیق فلسفے بآسانی سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور گلو گرفتہ وبستہ رسن جفا کو حوصلہ بخشتی ہے گویا ان کی شاعری معلم بن کر ہمیں اپنی زبان بے زبانی سے بہت کچھ سکھا دیتی ہے سمجھا دیتی ہے ان کی شاعری نے نہ صرف فکری طور پر کمزور شخص کی رہنمائی کی ہے بلکہ زمانے کی شکم پرستی نے جن بزدلوں

ISSN : 2582 - 3612

سے قوت گویائی تک چھین لی تھی اسے بھی جنبش لب کا سودمند ونفع بخش ہنر سکھاتی ہے جہاں انسان حق بولتے ہوئے ہچکچاتا نہیں یہ بے باکی یہ جانبازی افتخار عارف کا ہی حصہ ہے اسی تناظر میں ان کی غزل ملاحظہ ہو۔

اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے — دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ — رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

یہ جرأت سوائے افتخار عارف کے کہیں اور نہیں ملتی جہاں ہر ہر لفظ زندگی کی کبھی نہ مٹنے والی سچائی کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے اشعار کو وجود بخشنے کے لئے رزق حلال ،فکر حلال، زبان حلال کی ضرورت لاحق ہے جو افتخار کی ملکیت ہے ان کے اشعار وجود بشر کے شانہ شعور کو جھنجوڑتے ہوئے اس پر فہم وادراک کے کئی دروا کرتے چلے جاتے ہیں جس کا ہر در علم وآگہی کے نایاب گوہر اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔

جدید اردو شاعری کی زمین پہ افتخار عارف کی شاعری کلاسیکیت سے آویزاں ملبوس زیب تن کئے ہوئے محفل شعر وسخن کی زینت کو بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری فقط جہان حیرانی واضطرابی کی لامتناہی دنیا کی ہی سیاہ گر و مسیحا نہیں بلکہ ان کی غزلوں کا ہلکا پھلکا انداز الفت وفداکاری کے لطیف جذبات کو ہماری رگ رگ میں پیوست کر دیتا ہے کہ اچانک ہمیں محبت اچھی لگنے لگتی ہے اس کی فتنہ سامانیوں سے بھی ہمیں رغبت ہونے لگتی ہے اور اس کے نتیجے میں ملنے والے درد وکرب زندگی کا اثاثہ معلوم ہونے لگتے ہیں محبت میں کی جانے والی شوخیاں اور نادانیاں مژگان قلب پہ شرر بن کے دہکنے لگتی ہیں اور دل بے ساختہ کسی ساتھی کا متمنی ہونے لگتا ہے افتخار عارف کی یہ غزل دیکھیں۔

دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو — کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو
میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے — میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساتھی ہو
وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے — گلی گلی میری رسوائیوں کا ساتھی ہو

افتخار عارف کی شاعری کا سب سے متبرک پہلو واقعات کربلا کا تذکرہ ہے جو ان کی شاعری کو مستند، پائیدار ومعتبر بناتا ہے جبکہ بیشتر شعراء نے اپنی شاعری کو واقعات کربلا کی طہارت سے مطہر کیا ہے مگر جو پاکیزگی، جو طہارت افتخار عارف کے یہاں پائی جاتی ہے کم ہی شعرا کو یہ اعزاز نصیب ہوا کیوں کہ ان کی شاعری میں نہ صرف مکمل فنکارانہ خوبیاں ہوتی ہیں بلکہ کہیں کہیں میر انیس سا سوز و درد تڑپتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کی غزلوں میں ان کا انقلابی وحق پرستی سے مزین لہجہ موجود ہے جو دل کو گدازیت اور آنکھوں کو سوزیت عطا کرتا ہے اور ایسے اشعار کی تخلیق کے لئے نہ صرف قرطاس وقلم کی سیاہی کا بلکہ طینت وفکر کا بھی مومن ہونا لازمی ہے اور یہ مومنیت افتخار کی روح کا خاصہ ہے کیونکہ قلم جس دست میں موجود ہے اگر وہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

صاحب دست مولائے کل، دانائے سبل، ختم الرسل اور یداللہ، اسداللہ اور سبط نبی سیدالشہداء کی عظمت کا قائل نہ ہوتا تو ایسے ایسے نایاب خیالات صفحہ قرطاس پہ ہرگز اپنی روشنی بکھیرتے نہ نظر آتے۔ ان کی شاعری نفس کربلا و قربانئ امام حسینؑ کی مقصدیت وافادیت وحقانیت کو واضح کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے شرط ہے ایمان کی آنکھیں وا ہوں ملاحظہ ہو۔

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانہ ہے
مشکیزے کا تیر سے رشتہ بہت پرانا ہے

کاسئہ شام میں سورج کا سر اور آواز اذاں
اور آواز اذاں کہتی ہے فرض نبھانا ہے

حقائق سے تراشیدہ اور مذہبی تلمیحات سے پرلوازمات کو اپنی شاعری میں مقام دے کر انہوں نے اسے مزید تنوع بخشا جس سے بلا کی تاثیر ان کی شاعری کا جز بنی۔ انہوں نے واقعات کربلا کے تناظر میں عصر حاضر کے مسائل کو بڑی دانائی سے سمویا ہے اور کامیاب منظر کشی کی ہے جس کے نتیجے میں عہد حاضر کی بولتی ہوئی تصویر ہمارے سامنے جلوہ نما ہو جاتی ہے۔

یقیناً کربلا ایک جنگ نہیں ایک معرکہ نہیں بلکہ تفسیر دین کو منزل تکمیل تک پہونچانے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ چشم تاریخ نے سرزمین کربلا پہ دین کو بہتر کی لاش اٹھاتے ہوئے دیکھا، کبھی اٹھارہ سال کے شبیہ رسول علی اکبر کی لاش، کبھی بتیس سال کے جواں سال برادر عباس علمدار کی لاش، کبھی تیرہ سال کے بھتیجے قاسم ابن حسن کی پامال لاش، کبھی عون ومحمد فرزند شہزادی زینب سلام اللہ کی لاش اٹھاتے ہوئے دیکھا اور کبھی خود دین کا گلا زیر خنجر دیکھا اور اسے تین دن کا بھوکا پیاسا مثل گوسفند ذبح ہوتے دیکھا، شدت عطش سے آل دین کو العطش العطش کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیکھا ششماہے علی اصغر کو تاریخ کربلا نے خون اگل کے مرتے دیکھا یہ دین کوئی اور نہیں بلکہ ذات امام حسینؑ ہے کیوں کہ دین کی مکمل تعریف معین الدین چشتی نے یہ کہہ کر کی کہ۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسین

اسی دین کو تاریخ نے بہتر لاشے اٹھاتے ہوئے اور ہر لاش پر سجدہ شکر کرتے ہوئے دیکھا تب جا کر دین کامیاب ہوا۔ قوت بازوئے دین کو پیاس سے جاں بلب دیکھا شعر دیکھیں۔

دریا پہ قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

یقیناً ان غزلوں کے وسیلے سے اگر لوگ کربلا سمجھ لیں تو انہیں شریعت وطریقت کے مکمل باب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور افتخار عارف جیسا شاعر دانشگاہ کربلا سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے تو اس کے قلم کو حق بیانی کا گر ورثے میں مل جاتا ہے اور تب جا کر وہ کہہ پاتا ہے۔

خزانہ زر وگوہر پہ خاک ڈال کے رکھ
ہم اہل مہر ومحبت ہیں دل نکال کے رکھ

ISSN : 2582 - 3612

ذرا سی دیر کا ہے یہ عروج مال ومنال
ابھی سے ذہن میں سب زاویئے زوال کے رکھ

بعض اوقات ان کی شاعری کے حسین کینوس پر بے چارگی ولاچاری کے سیاہ وتاریک دھند لکے بھی چھائے ہوئے ملتے ہیں کے مگر اس تاریکی میں بھی روشنی کی رجائیت اور سیاہی میں اجالے کی رمق کہیں دور سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے ملاحظہ کریں۔

جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ مرے تھے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے

جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سرو ساماں بھی مرا ہے

افتخار عارف کی گلستان شاعری میں رمزیہ اشاروں، لطیف کنایوں کی ایک دنیا آباد ہے، یہاں موضوعات کا ٹھاٹیں مارتا ہو بیکراں سمندر ہے، علامتوں کی مسحور کن خوشبو ہے، دلکش ودیدہ زیب استعاروں کی رنگینیاں ہیں، تشبیہات کی دلآویزیاں ہیں ذرا سیر کریں۔

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو

افتخار عارف کی غزلیں بعض اوقات سماج ومعاشرے کے رعونت زدہ اذہان کی طنابیں اس دلیری سے اتار پھینکتی ہیں کہ ایک عالم دم بخود رہ جاتا ہے اور جس کی ہیبت تا قیام قیامت زائل کرنے کی جرأت کسی بھی صاحب اقتدار و مسند نشیں پیدا کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

افتخار کی شاعری بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ان کی شاعری کا ادراک انتہائی ذکی ومتین ہے۔ ان کی شاعری ہمیشہ تعبیروں وتدبیروں کی جستجو میں جلتی سلگتی شاہراہوں اور ریزہ ریزہ ہوتے وہم وگمان کے تھکن آمیز سفر میں تندرست وتوانا رہی اور ہمیشہ ٹوٹتے ہوئے خوابوں کی اذیتوں سے زندگی کرنے کے نئے حوصلے اجاگر کرتی رہی اور زندگی کے رخ پہ بکھرتے سمٹتے رنگوں کی طرح اور ان رنگوں میں رقص رچاتی کرنوں کی طرح اذہان بشر میں زندگی کی تازگی پھونکتی رہتی ہے۔

افتخار عارف کی شاعری کہیں نغمہ گل ہے کہیں حرف قصاص کہیں کلیجہ چیر دینے والی حقیقتوں سے مزین تو کہیں خواب آوری کے سرور ورعنائی سے پیراستہ ہے جو بیک وقت دل کو رنجور ومسرور کرتی ہے ایک ایسی بوقلمونی ہے جس سے وجود میں آنے والے عکس انتہائی جانباز اور حق گو ہیں جو خون ناحق کا قصاص لینے کے فن کا بھی ادراک عطا کرتے ہیں، جس عکس کے رنگوں میں زمانہ شناسی کی کاریگری ہے جس کا قرطاس زندگی کی سفید وسیاہ حقیقتوں سے آشنا ہے اور قلم میں رواں شجیع اور دلیر سیاہی ایک جانباز سپاہی کی طرح اپنے تمام شہپر، نیزے، خنجر، تیر، تلوار سے لیس ہو کر عہد ناسور زدہ کی جراحی کرتی ہوئی چلی جاتی ہے اور بالآخر ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو توانائی، صحتمندی، کی سپر سے آراستہ ہو کر آئینہ جہان میں اپنے وجود کی پاکیزگی نشر کرتا چلا جاتا ہے اس تناظر میں افتخار عارف کی یہ نظم "ابوطالب کے بیٹے" ملاحظہ ہو

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ابوطالب کے بیٹے سربریدہ ہوکے بھی اعلان حق کرتے رہے ہیں
ابوطالب کے بیٹے پابجولاں ہوکے بھی اعلان حق کرتے رہے ہیں
ابوطالب کے بیٹے صرف زنداں ہوکے
بھی اعلان حق کرتے رہے
مدینہ ہونجف ہوکربلا ہوکاظمین ہودسامرہ ہومشہد ہوبغداد ہو
آل ابوطالب کے قدموں کے نشاں
انسانیت کواس کی منزل کو پتہ دیتے رہے ہیں دیتے رہیں گے
ابوطالب کے بیٹوں اور غلامان ابوطالب میں اک نسبت رہی ہو۔محبت کی یہ نسبت عمر بھر قائم رہے گی تاابد قائم رہے گی

ان کی شاعری ہرلمحہ وجود میں دھڑکتے ہوئے پاکیزہ جذبات، نیک خیالات و ہزاروں مبہم خیالوں کومہمیز کرتی رہتی ہے جس سے انسان کے وجود میں ایک قسم کی روحانی قوت پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں انسان حقیقی معنوں میں انسانیت کی اس منزل پہ پہونچتا ہے جہاں وہ اصل معنوں میں اشرف المخلوقات ہونے کا مصداق بن جاتا ہے۔

ان کی بیشترنظموں میں بکھری کائنات،اٹھکھیلیاں لیتے امکانات،انگڑائیاں لیتے صدمات، نشتر چبھوتے نظریات، جگر چھلنی کرتے تجربات، مہکتی فصاحت، چہکتی بلاغت، کنایہ کے روشن چراغ انکے اثاثہ شعروسخن کوانمول بناتے ہیں۔ان کی نظموں میں موج انتشار سے ہرلمحہ الجھتے ہوئے جرائم وآلودگی کے تمام آثار کومسمار کرکے امن وسکون کے تازہ وصحت مند خط وخال کوسنوارنے کی دلیرانہ جرأت موجود ہے۔

افتخار حسین عارف کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے ان میں مہر دو نیم، حرف باریاب، جہان معلوم، کتاب دل و دنیا نے کافی شہرت و پزیرائی حاصل کی ۔انہیں 1988 میں فیض انٹرنیشنل ایوارڈ، 1994 میں نقوش ایوارڈ، 2005 میں ستارۂ امتیاز حاصل کیا۔

مختصر یہ کہ افتخار عارف کی شعری حیات آب زر سے رقم کئے جانے کے قابل ہے یہ ہستیاں زمین پہ آسمان جیسی ہیں۔ان کی شاعری کا عرصہ حیات ہمیشہ سے دریدہ حسرت وخواب بریدہ تمناؤں کے ساتھ فصیل نیزہ شہرت پر اپنے ہنر کی معجزنمائی کرتا رہا جس نے نقوش ادب کے کمندناز کوکبھی منتشر ہونے نہیں دیا۔ یہ ہمیشہ عرض ہنر میں حرف اعتدال، حسن بینی کے آداب، ہم نشینی کے فرائض، صف دوستاں کی ذوق نارسائی، کواپنے فن کے لہو سے وضوکر کے جدت کی حرف آگہی کوخود پہ توکبھی زمانے والوں پہ واکرتے رہے ۔ان کی شاعری عرصہ اتصال شاعری وحق بیانی میں انتہائی وضع احتیاط سے وحشت تعقل پسند کواسیر عدم کرتے

ہوئے وحشت شب کی عزاداری میں جاں نذرگزاری کے جاں فزاعمل سے گزرتے ہوئے کار جہاں کے منصب پہ کبھی ندرت خیال اورآہنگ سے توکبھی لہوکی حدت سے مقتل میں چمکتی ہوئی تلوار کی مانند نصرتوں کا علم بلند کرتی ہوئی نظرآتی ہے۔ان کی شاعری امکانات کی فاقہ مستی میں بھی اپنے خیالات کی ندرت کوتا رریزہ کفن کی مانند ہرساعت امروز میں لہجہ سکوت سے حرف اعتبار کومنزل ادراک تک پہونچاتی ہے۔

انہوں نے شاعری کے ذریعہ اسم ذات کی تسخیر کرتے ہوئے ہرجادہ دشوار کی دریدہ جبینوں کی ہمہ دم گردش تجسس وآشوب گزیدہ کشتہ امیدوں کوالفاظ کی تجسیم کے ذریعہ انتہائی جاں سوزی و پرکاری کو بروئے کارلاتے ہوئے آنسوؤں کے سرخ ریشم سے فشار نیم شبی کی کیف آمیزیوں کوسخن ارزانی کی مشکلوں سے نکال کرسوختہ جانوں کوخزینہ خواب وگرائی فن کا خراج بخشتا ہے۔۔یہاں تمام مردہ احراف خموشی کی قبا زیب تن کئے محوگفتگونظرآتے ہیں جہاں مسافران شب، نازنینان خوش اندام کی چشم خوش آب میں درد کی سوفار توڑنے کے بجائے انہیں کوزہ درد میں خوشیوں کا سمندر عطا کرنے کے فراق میں رہتے ہیں۔یہاں لفظوں کی سفاک سنائیں اور لہجے کی شمشیریں روح سے جھنکار کھینچنے کے بجائے جسم کے زرد جزیروں میں نمو بخشنے کے فراق میں سرگرداں رہتی ہیں۔انہوں نے روایات لب ورخسار کوتوڑنے کی جسارت کرتے ہوئے محفل شعروسخن کوہوس کی حیلہ سازیوں سے آزاد کرکے جسم کے قریہ بےنور کوپلکوں پہ الجھتی ہوئی شہوت کی تعبیروں سے بے نیاز کیا یقیناً سخن وروں میں کوئی انکی طرح دیدہ ورموجود نہیں جنہوں نے اپنے لہو کے چاک پیراہن سے ادب کوشفا بخشی ہو۔ان کی شاعری میں بعض اوقات کرب ویاس کی شہ رگ پہ یوں نشاط و آس کا خنجر ہوتا ہے جیسے ریت پہ کچھ حرف رائیگاں سے، جیسے بےصدا گلیوں میں بے چراغی، جیسے مقتل دہشت گزیدہ میں عجب رقص آشوب، جیسے سرنوشتہ تقدیر پہ خواب کی صداقت، جیسے شہر منافق کی اداس راتیں خاک پہ بیٹھی اشک کناں، جیسے منصب دلبری پہ فائز ہوکر لذت خلش دل۔غرض خلق خدا ان کی شاعری پہ نازاں ہے۔

Dr. Masrur Soghra
Asstt. Professor
(Guest Faculty)
C. M. College, Darbhanga
Bihar
Mob.- 96351 51358

ڈاکٹر وکیل احمد

شہریار اپنی نظموں کے آئینے میں

جدید شعری منظرنامے پر نمودار ہونے والے اچھے اور معتبر شاعروں میں ایک بڑا نام شہریار کا ہے۔ کنوراخلاق محمد خان "شہریار" (16 جون 1936ء میں پیدا ہوئے اور 13 فروری 2012ء وفات پا گئے۔ وہ اردو زبان وادب اور شاعری کی مشہور ہستی کے طور پر جانے گئے۔ وہ بالی وڈ کے ایک نغمہ نگار کے طور پر بھی معروف ہوئے اور آج تک گمان (1978ء) اور امراؤ جان (1981ء میں بنی فلم) کے نغموں کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ شہریا ایک الگ طرح کے شاعر تھے، ان کی فکر اور ان کی سوچ مروجہ فکر اور سوچ سے الگ تھی۔ وہ روایت پسند ہوتے ہوئے بھی روایتی نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ شہریار کی شاعری میں خواب، رات، دھند، آگہی، موت جیسی لفظیات کا استعمال بار بار ہوا ہے اور انھیں ایک مضبوط استعارے کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی ہے۔ یہ تمام الفاظ معنی کی سطح پر ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔

اصل میں جدید دور کا انسان جن اندرونی کرب سے دوچار تھا اس کے اظہار کے لئے یہ الفاظ زمانے اور حالات کے حساب سے مناسبت رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہریار نے ان الفاظ کے سہارے اپنے اندرون کے کرب اور بےچینی کا برملا اظہار کیا ہے۔

شہریار کی شاعری میں خواب، رات، دھند، آگہی اور موت جیسے الفاظ کہیں نہ کہیں تنہائی کے کرب کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تنہائی کا اظہار کھل کر کیا ہے اور بار بار تکرار کے ساتھ کیا ہے۔ تنہائی کا یہ احساس ان کی شاعری میں کہیں ایک فرد اور ایک شخص کا تجربہ معلوم ہوتا ہے اور کہیں ایک شخص کا تجربہ پوری اجتماعیت کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ شہریار کی پوری شاعری خواہ نظم ہو یا غزل دونوں میں سوالیہ اندازِ فکر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ اس اندازِ فکر کی خاصیت شاید یہ ہے کہ اس میں معنی کی مختلف جہتوں تک رسائی کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ جیسے کیا ہے، کیوں ہے، کیسے ہے، کون ہے وغیرہ الفاظ انسان کے اندر تجسس کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

ان کا استفہامیہ لہجہ قاری کو تجسس کے اس عمل میں برابر کا شریک ٹھہراتا ہے۔ ان کا مخاطب کوئی ایک فرد نہیں بلکہ یہ تمام عمومی سوالات فرد کی ذہنی کشمکش کو پیش کرتے ہیں۔ دن رات، چاند اور سورج کے عمل

پر لگایا گیا سوالیہ نشان بےاعتمادی کو اعتماد میں بدل دینے کی ارادی کوشش ہے۔ ان کی نظموں میں استفہامیہ انداز غالب ہے اور ان میں یہ جاننے کی خواہش زوروں پر ملتی ہے کہ جس احساس کے ساتھ شعری کردار جی رہا ہے اس میں کوئی اور بھی شریک ہے یا نہیں؟ ان کی نظموں میں پیدا یہ سبھی سوالات یونہی نہیں ہیں بلکہ منطقی اور استدلالی ہیں۔

شہریار کی نظمیں ہندوستانی مزاج کے قریب تر ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندو مذہب کے مختلف عقائد و رسومات کو استعارے و علامت کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے، اس طرح انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانیت کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شہریار کے خاندانی پس منظر کو اگر دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو مذہب کے متعلقات کا بیان ان کے لاشعور کا حصہ ہیں یا پھر ان کی شاعری میں تہذیبی عناصر صبح کے وقت مندروں سے آنے والی بھجن کی آوازوں سے غیر شعوری طور پر اخذ کرنے والے تاثرات کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ ان کے یہاں مندر، کلس، سنکھ، دیوداسی جیسے تلازمات نظم کی فضابندی میں معاون و مددگار ہیں۔ اسی طرح ناریل توڑنا اور اشلوک پڑھنا ہندوازم کے عقائد میں شروع سے ہی شامل رہے ہیں جو کہ آج بھی ہیں۔ اسی طرح موت کے بیان میں اس قسم کے استعارے فن کار کی منفرد سوچ کو ظاہر کرتے ہیں، شاعر نے دراصل موت کو ہی تمام مسائل کا حل تصور کیا ہے۔ کبھی کبھی ان کی نظمیں پُرلطف بیانیہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ شہریار نے اپنی نظموں کو کئی طرح کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی کیفیات سے ہم آہنگ کیا ہے، جیسے انھوں نے تشبیہ استعارے اور پیکر تراشی و علامت سے مزین ان کی نظمیں ایک خاص لطف ولذت رکھتی ہیں نظموں کے موضوعات بیحد پُرلطف اور پُرکشش ہیں۔ لہجہ بھی توانا اور منفرد ہے۔ ان کی نظموں میں جذبات کی عکاسی جا بجا کی گئی ہے۔ شہریار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں موضوعات کا تنوع، سادہ الفاظ، حکائی انداز، تمثیلی و علامتی پیرایہ اظہار، مناسب و متضاد الفاظ، لہجے کا دھیما پن اور جذباتیت سے پُر کیفیات کو بخوبی برتا ہے۔ جب کہ غزلوں کے مقابلے میں شہریار کی نظموں کا ذخیرہ بھی کم نہیں ہے۔ وہ نظم گوئی اور غزل گوئی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان کی نظمیں اپنی خاص فکر وفن کے لحاظ سے بلند مقام رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں اپنی روایت سے بغاوت کے باوجود کمال ملکہ رکھتی ہیں انھوں نے نظموں میں بھی کلاسیکیت یکسر نظرانداز نہیں کیا ہے۔ اس لیے ان کی نظمیں نئی ہونے کے ساتھ فطری بھی ہیں۔ نئے زمانے کے مسائل، عصری حسیت، شہری زندگی، انسانی اقدار کی پامالی، ناکامیاں، محرومیاں، خوشی وغم جیسے موضوعات کی خوب نمائندگی کرتی ہیں، نظم کے بند ملاحظہ کریں۔

ابھی نہیں ابھی زنجیرِ خواب برہم ہے

ابھی نہیں ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ابھی در باز ہے امیدوں کا
ابھی نہیں ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں ابھی کم بخت دل دھڑکتا ہے

(موت) اسم اعظم

دن کے صحرا سے جب بنی جان پر
ایک مبہم سا آسرا پاکر
ہم چلے آئے اس طرف اور اب
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں!

(فریب در فریب) اسم اعظم

بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو، غم، امید، محرومی
نیند کی گولیاں، گلاب کے پھول
کیلے، امرود، سنگترے، چاول
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق

سچ تو یہی ہے کہ دور حاضر کا انسان عجیب وغریب کے مسائل سے دوچار ہے۔ان میں تنہائی کا خوف، عدم تحفظ، بے چارگی، زندگی سے مایوسی، غربت وافلاس کا خوف زیادہ خطرناک ہے، شہریار کی نظموں میں بھی اس کے واضح اشارے موجود ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے، نظم کا بند ملاحظہ کیجئے۔

ہاتھوں میں نہیں حرکت کوئی
محروم ہیں گویائی سے لب
آنکھوں کو دید کی تاب نہیں

ISSN : 2582 - 3612

انکار ہے دل کو دھڑکنے سے
اور گوش، سماعت سے خائف
چھو کر تو ذرا دیکھو اس کو
انسان ہے یا ہے بت کوئی

(انسان یا بت) ساتواں در

میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف، اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی
بارہاں کر چکا کوشش میں تو
تم بھی اپنی سی کرو
اس تگ ودو کے لیے خواب مرے حاضر ہیں
نیند ان خوابوں کے پروازوں سے لوٹ جاتی ہے
سنو، جاگنے کے لیے ان کا ہونا
سہل کر دیگا بہت کچھ تم پر
آسماں ریگ میں کاغذ کی ناؤ
رک گئی ہے اسے حرکت میں لاؤ
اور کیا کرنا ہے تم جانتے ہو
میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف
اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی

(میں نہیں جاگتا۔۔۔) نیند کی کرچیں

ہنسنے کے جتنے مقام آئے ہنسا
بس مجھے رونے کے ساعت پہ خجل ہونا پڑا
جانے کیوں رونے کے ہر لمحے کو
ٹال دیتا ہوں کسی اگلی گھڑی پر
دل میں، خوف ونفرت کو سجا لیتا ہوں
مجھ کو یہ دنیا بھلی لگتی ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بھیڑ میں اجنبی لگنے میں مزا آتا ہے

(زندہ رہنے کا احساس) نیند کی کرچیں

حقیقت تو یہی ہے کہ خود اپنے عہد سے انسان ہارا ہوا ہے کیوں کہ اس کا عہد ہی اس کا قاتل ہے جو انسان کی نفسیاتی اور جذباتی پیچیدگی اور اس کے احساس میں شدت پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے ان کے اندر ایک طرح کا جنون طاری ہو جاتا ہے۔ شہریار بھی جیسے جیسے اپنی داخلی و خارجی دنیا سے آگاہ ہوتے گئے ان کی الجھنیں بڑھتی گئیں ہیں۔ انھیں نفسیاتی و جذباتی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی شخصیت اور شاعری کا جو تجزیہ پیش کیا وہ کمال ہے :

> ''وہ اپنی اندرونی شخصیت کی تلاش میں ہے اور اس تلاش کے لیے اس نے شاعری کا سہارا لیا ہے۔ اس کی ساری نظمیں در اصل ااسی جستجو کی روداد ہیں۔ خواب اور حقیقت کا ٹکراؤ، دن اور رات کی کش مکش، بھری دنیا میں تنہائی کا احساس، فریب اور خود فریبی، سراب، صحرا، ریت، تاریکی، دھندلکا، گمشدگی، بازیافت، کرب، موت اور زندگی دونوں کی خواہش اور دونوں سے فرار۔ یہ وہ داخلی مسائل ہیں جن سے اس کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اس کی نظموں میں کہیں مدھم اور کہیں واضح طور پر یہ آہیں سنائی دیتی ہیں۔''

(شہریار، مرتب سرور الہدیٰ، ص۔112)

شہریار نے اپنی نظموں میں علامت نگاری کی بہت ساری مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کی شاعری میں جدید علامتیں، نئے نئے موضوعات اور انسانی جذبات واحساسات کو بڑی ہی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے یہاں برجستگی اور بے شاختگی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی تقریباً نظمیں شعریت سے پر ہیں، نظم کے بند دیکھیے ۔

دن کا درواز ہوا بند شبِ تار آئی
راستے کروٹیں لینے لگے
گلیوں میں اداسی چھائی
سارے ہنگامے، وہ سب رونقیں (دن کی ہمراز)
گونگی جیلوں میں ہوئیں قید
چلو اب نکلیں
اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر

دیکھیں
اپنا سایہ کہاں جاتا ہے شبِ تار میں آج
کون سی یادوں کو چمکاتا ہے
کس پل کو صدا دیتا ہے
آج کیا کھوتا ہے، کیا پاتا ہے
کس طرح بڑھتا ہے، گھٹتا ہے، بکھر جاتا ہے
کیسے مر جاتا ہے؟

(سائے کی موت) اسم اعظم

جدیدیت پسندوں کی بھیڑ میں جہاں ایک سے ایک شعرا موجود ہوں وہاں اپنا مقام قائم کرنا بڑی بات ہوتی ہے اور پروفیسر شہریار صاحب نے جس خوبی سے اپنی انفرادیت قائم کی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں میں روایت کی پاسداری کرنے کے ساتھ خوشگوار اضافے بھی کیے اور اظہار خیال کی نئی زمین بھی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں جو انفرادیت ہے وہ مستعار نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی ملکیت ہے اور وہی ان کی شناخت بھی ہے۔

اگر ہم پروفیسر شہریار کی شاعری کا بغور مطالعہ سنجیدگی سے کریں تو جدت پسند شاعری کے خلاف جو نفرت ہے وہ اپنے آپ ہی دور ہو جائے گا، بہرکیف نئی نسل کے شعرا اپنے تخلیقی عمل کے دوران ان کی شاعری سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

Dr. Wakil Ahmad
At - Babu Salimpura
P.O -Raiyam Factory
Darbhanga (Bihar)

ڈاکٹر فہیم ربانی

اردو غزل میں خواتین کا حصہ

اردو شعروادب کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو فروغ دینے میں خواتین بھی فعال قلم رہی ہیں خصوصی طور سے اردو غزل کے منظرنامے پر خواتین کی ایک جم غفیر موجود ہے جن کی غزلیہ شاعری انفرادیت کا حامل نظر آتی ہیں۔ان شاعرات میں ادا جعفری، زہرہ نگار، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، منصورہ احمد، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، عشرت آفریں، ترنم ریاض، شفیق فاطمہ شعریٰ، پروین شیر اور صوفیہ انجم تاج کا نام خاص طور سے اہم ہے جنہوں نے اردو غزل کو نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری سے عورت کی بیداری کا پتہ چلتا ہے اور اس کے حسی اور جذباتی رویوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

مذکورہ تمام شعرا کے یہاں زندگی کے تمام تر مسائل پر لکھی گئی غزلیں ہمیں مطالعہ کے لئے مل جاتی ہیں۔سماجی تہذیبی وثقافتی، سیاسی اور حسن وعشق کے مسائل پر یہ تمام شعرا نے خصوصی توجہ دی ہے۔اس سلسلے سے پروین شاکر کی غزل گوئی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے یہاں تخلیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ فکری رویے بھی موجود نظر آتے ہیں۔تمام غزلیں ان کی مشاہداتی قوت اور عمیق مطالعے کا پتہ دیتی ہیں۔اسلوبیاتی اعتبار سے بھی شگفتگی اور دلسوزی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سلسلے سے پروین شاکر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

چاند بھی مری کروٹوں کا گواہ — میرے بستر کی ہر شکن کی طرح
بارہا تیرا انتظار کیا — اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح
عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی — اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں — اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

مذکورہ بالا تمام اشعار میں حسن وعشق کی موجودگی ہے۔شاعرہ نے نسوانی جذبات کی بہترین عکاسی بھی کی ہے اور یہاں رنگ تغزل بھی قابل قدر ہے۔رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ مطلب یہ کہ رومانی فضا کے ساتھ ساتھ احساس کرب بھی ان کی غزل کا ایک خاص پہلو ہے۔محبوب سے بچھڑنے کا کرب انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے ؎

ISSN : 2582 - 3612

اب ان دریچوں میں گہرے دبیز پردے ہیں — وہ تاک جھانک کا سلسلہ بھی گیا
شدید دکھ تھا اگرچہ تیری جدائی کا — ہوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا
کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اس سے — بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا

مختصر یہ کہ پروین شاکر کی غزلوں میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں نظر آتی ہے۔لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ان کی غزلوں میں تہذیب وشرافت۔خیالات کی پاکیزگی اور فکری بالیدگی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس سلسلے سے کشور ناہید کا نام بھی خاص طور سے اہم ہے۔انہوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے، حسن وعشق کے مروجہ تصور کو تبدیل کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں نسائی لہجہ ایک واضح رجحان کی طرح سامنے آیا ہے۔وہ اپنے عورت ہونے کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں۔مختصر یہ کہ نفسیاتی کیفیات ذہنی پیچیدگیوں اور فکری تغیرات کی پیشکش پر بھی کشور ناہید خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ انہیں اپنی انا خودداری اور شناخت بہت عزیز ہے، جس کا اظہار وہ اپنی غزلوں میں خوبصورت انداز میں کرتی ہیں۔لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ کشور ناہید کی غزل انسانی زندگی کے مختلف رنگوں کا عکس ہے۔ان کی غزل میں انسانی زندگی کے سارے سکھ دکھ نظر آتے ہیں۔مثلاً۔انسانی اقدار کا نوحہ، انسانی جذبوں اور رشتوں کی اہمیت، انسانیت کی پامالی پر احتجاج، تنہائی کا کرب، صنف نازک کا استحصال وغیرہ۔کشور ناہید کی غزل عورتوں کے مرتبے کو بھی پیش کرتی ہے۔اس سلسلے سے ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہم نے بہت دن اے دل تیرے خواب سنبھالے — کون کہاں تک بیتی شب مہتاب سنبھالے
میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی — اس کو چاہوں بھی تو خود اپنی خبر سے چاہوں
وہ میری آنکھیں جنہیں تم نے طاق پر رکھا — ان ہی میں منزل جاں کا سراغ ملتا ہے
پہلے اس کو دیکھا تھا یا پہلے اس کو چاہا تھا — ایسی باتیں کیا سوچیں جب سب اقرار زبانی ہوں

مذکورہ بالا تمام اشعار کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ جس طرح کشور ناہید نے انسانی زندگی کے مسائل کو پیش کیا ہے وہیں ہجر کی راتوں کا کرب کیا ہوتا ہے اور خودسپردگی کا نشہ کیا ہوتا ہے اس پر بھی مزید روشنی ڈالی ہے۔اس لئے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کی غزل میں قوس قزح کے سارے رنگ ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''پانی پر تیرتے جھلملاتے چراغوں کی طرح ان کی شاعری اگر ایک طرف عصری تضادات کا شعور بخشتی ہے تو دوسری طرف جذبوں کی شدت کو خوشبو کی حدت کو رنگوں کی خوشبو کو اور شعلوں کے رنگوں کو محسوس کراتی ہے۔اپنی تمام تر بغاوتوں اور روایت سے انحراف کے باوجود محبت کا موسم ان کی شاعری پر بھی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

جاری ہوتا ہے اور ان کے اشعار میں گرتی ہوئی شبنم کھلے ہوئے ریشم سرسراتی ہواؤں اور گنگناتی فضاؤں جیسا لہجہ بھی محسوس ہوتا ہے۔''

(رسالہ معاصر اردو ادب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص۔۲۹۵)

یہ حقیقت ہے کہ صنعتی انقلاب نے جس طرح ترقی کے زینے طے کرائے اسی کے برعکس انسانی اقدار کو پامال بھی کیا۔ اضطراب، اداسی، بے یقینی اور بے سمتی نے اردو شاعرات کو کافی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعرات نے استحصال کرنے والوں کے لئے بھیڑیا، ریچھ، کتا، سانپ، درندے جیسے ٹائٹل استعمال کئے۔ اس ضمن میں ساجدہ زیدی کا نام خاص طور سے اہم ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک بہت قوی رجحان مثبت رویے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ساجدہ زیدی خواب بھی دیکھتی ہیں اور خوابوں کے ٹوٹنے پر افسردہ بھی ہوتی ہیں، لیکن خواب دیکھنا ترک نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک نئی امید دیکھنے کو ملتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے یہاں منفی رویہ اور ناامیدی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس سلسلے سے ان کا یہ شعر دیکھئے ؎

سکوت نسیم شب کی آہٹیں اور رات کا جادو یہ منظر ساتھ لے آیا مری دلداریاں کیا کیا

اس شعر کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ ساجدہ زیدی نے معاصر اردو شاعری کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ اسے اپنے ماحول اور معاشرے کا ترجمان بنایا ہے۔ اس باعث اردو غزل میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

اردو شاعرات کی صف میں ایک اہم نام پروین شیر کا بھی ہے۔ انھوں نے بھی اردو غزل میں طبع آزمائی کر کے اس صنف کو عروج کے زینے طے کرائے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم زندگی کے سارے رموز ونکات سے روبرو ہوتے ہیں۔ اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

مضمحل ہوں لاکھ لیکن حسرت پرواز دیکھ بال و پر کو پھرپھرائے بن مزا ملتا نہیں
پھر کوئی پروین طوفاں آئے گا پر سکوں ہیں آج کل پروائیاں
مری حیات کی بس اک یہی ادا ٹھہری کہ حوصلوں کی تمنا ہی انتہا ٹھہری
چارہ گر کی جستجو میں ہوش کھو بیٹھے تھے ہم مجھ سے مل کر اس کو اپنا بھی پتہ ملتا نہیں

مذکورہ بالا تمام شاعرات کی غزلوں کا مطالعہ اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی غزلیں اردو غزلیہ شاعری کو ایک نیا رنگ وآہنگ عطا کرنے میں معاون ومددگار ہیں۔

Dr. Fahim Rabbani
At/P.O. - Mohiuddinpur Pakri
Via - Benipur
Darbhanga (Bihar)

ڈاکٹر نسرین بانو

علامہ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری

علامہ شبلی نعمانی بہت ہی مشہور عالم دین، سوانح نگار اور تاریخ نویس تھے ان کی ولادت باسعادت صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک جانا مانا گاؤں بندول جیراج پور میں 4/جون 1857ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے شروع کی تعلیم گھر ہی پر مولوی فاروق چریا کوٹی سے حاصل کی۔ اور حج جیسا دینی اور سب سے بڑے فریضہ کی ادائیگی کے لیے 1876ء میں مکہ تشریف لے گئے۔ آپ نے بڑی محنت کر کے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا اور وکیل ہو گئے مگر آپ کی فطرت اور طبیعت کو اس پیشہ سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا آپ نے اس پیشہ کو خیرآباد کہہ دیا۔ اس کے بعد آپ حصول علم وعمل کے غرض سے علی گڑھ گئے جہاں ان کی ملاقات وقت کی جانی مانی اور تاریخ ساز شخصیت سرسید احمد خان سے ہوئی، چوں کہ شبلی بحرالعلوم تھے ان کی صلاحیت اور قابلیت کو دیکھ کر سرسید نے انھیں فارسی کے استاد کے طور پر بحیثیت پروفیسر مقرر کیا، یہ سرسید کی علم دوستی، مردم شناسی اور مستقبل شناسی تھی کہ انھوں نے شبلی کو جانچا پرکھا اور استاد رکھ لیا، جب کہ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے، مگر سرسید چونکہ ایک دین دار اور ملت کے خیر خواہ تھے، وہ صرف اور صرف کام کرنا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انھیں مخلص، باصلاحیت اور قابل لوگوں کی ضرورت تھی، ایسے میں انھیں جو بھی جچا اسے بغیر جھجکے ہوئے اپنا رفیق بنا لیا۔ علی گڑھ کا یہ وہی وقت تھا جہاں سے شبلی کی علمی وتحقیقی زندگی کا آغاز ہوا، اور پھر شبلی قابل شبلی ہوئے۔ چوں کہ شبلی شروع سے ہی علم کے جویا تھے اور جب انھیں پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میسر آئی تو انھوں نے ان سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ نتیجتاً ان زبانوں کے سیکھنے کے بعد آپ نے 1892ء میں روم اور شام کا مبارک سفر کیا۔ اور 1898ء میں اپنی ملازمت ترک کر کے واپس اپنے وطن اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ چوں کہ شبلی کبھی بھی خالی بیٹھنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ مسلسل کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ہی پسند کرتے تھے اور ان کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ وہ قوم کے لیے کچھ کریں اسی غرض سے انھوں نے 1913ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ آخرکار ہر وقت متحرک رہنے والے شبلی 1914ء میں خاموش ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

علامہ شبلی نعمانی نے نو سوانحی تصانیف چھوڑی ہیں جو بیحد اہم ہیں بلکہ باقی سوانح نگاروں کی لکھی سوانح عمریوں سے کئی معنوں میں اہم ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں میں المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی،

سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبیؐ کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ جن میں انھوں نے اپنے عہد کی عظیم ہستیوں کے بارے میں اہم مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس میں علامہ نے اُن کی زندگی کے حالات، علمی فتوحات اور فکری بصیرتوں کے پھول کھلائے ہیں، خاص بات تو یہ ہے کہ شبلی نے اپنی سوانح عمریوں میں سوانح نگاری کے ساتھ تاریخ کو بھی شامل کیا ہے وہ بھی اس طرح کہ تاریخ کے اجزاء گھل مل کر سوانح کا خوبصورت حصہ بن گئے ہیں یہی وجہ ہے آج جہاں بھی ان کی سوانح کا تذکرہ ہوتا ہے وہیں ان کی تاریخ نگاری کا بھی ذکر ہوتا ہے جو کہ اہم پہلو ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شبلی کے نزدیک صرف سوانح نگاری کی ہی اہمیت نہیں تھی بلکہ تاریخ بھی اہمیت رکھتی تھی، کمال یہ ہے کہ شبلی نے قدیم طرز اظہار کے بجائے جدید طرز کے مطابق نئے مباحث پر محققانہ اور عالمانہ بحث کی ہے جس سے ایسے مغربی تصانیف کے بالمقابل اہمیت حاصل ہوئی۔

شبلی سے پہلے اُردو میں سوانح نگاری کا اپنا کوئی طرز اور اسلوب نہیں تھا بلکہ فارسی اور عربی کے اسلوب کے مطابق ہی لکھی جاتی تھیں، اُس میں جدید ذوق و رجحان کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ساتھ ہی ان تحریروں کی خشکی ایسی کہ کوئی پڑھنے کو راغب تک نہ ہو اس میں دلچسپی کوئی سامان نہیں تھا مگر علامہ شبلی نعمانی نے ان کمیوں اور خامیوں سے پاک کیا، اور انھیں نئے خیالات افکار سے اس طرح ہم آہنگ کیا وہ قابل مطالعہ شئے بن سکی۔ شبلی کی سوانح نگاری میں کارلائل کے اس فقرہ کا عکس ہم دیکھ سکتے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ ''تاریخِ عالم صرف عظیم انسانوں کی تاریخ کا نام ہے'' اگر اس بات کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ ان کے دل میں مشاہیرِ اسلام پر لکھنے کا شوق کیوں کر پیدا ہوا تو اس کا اندازہ ہمیں ان کی کتاب ''حیاتِ شبلی'' میں علامہ سیّد سلیمان ندوی کی اِس تحریر سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''مسلمانوں کی بیماری کا علاج ایک (سرسیّد) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد کی حفاظت اور بقاء کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔''

(حیاتِ شبلی)

شبلی کے متعلق یہ بات عام ہے کہ وہ مغرب کی وقتی چمک دمک اور مغربی تہذیب اور اُس کے ادب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے، وہ آخر آخر تک اپنی اسلامی تہذیب و تمدن پر نہ صرف جمے رہے بلکہ اس کی اشاعت کے لیے فکر مند بھی رہے، انھوں نے مستشرقین اور فرنگیوں کا ہر معاملے میں منہ توڑ جواب دیا اور ان کے ایک ایک سوال کا جواب دینے کے لئے کمر بستہ رہے۔ انھوں نے کبھی مخالف طاقتوں کے آگے سر

ISSN : 2582 - 3612

نہیں جھکایا، ہمیشہ سینہ تانے کھڑے رہے، ان کا کمال یہ ہے کہ اسلامی عقائد کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، عقائد اسلامیہ کی مدافعت میں ہمیشہ کھڑے رہے۔ اس تعلق سے علامہ خود لکھتے ہیں:

> ''یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطینِ اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اُس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہمیں یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے''۔ (مقالاتِ شبلی)

شبلی خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کو مرعوبیت، احساسِ کمتری اور ذہنی غلامی سے نکالنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ انھیں اپنی ماضی کی تاریخ سے روبرو کرایا جائے، اپنی تاریخ کا مسلمانوں کو گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرایا جائے تب ہی جا کر مسلمان، پستی سے باہر آسکیں گے، ورنہ کوئی صورت نہیں کہ مسلمانوں کو غلامی کے دلدل سے نکالا جاسکے، تاریخِ اسلام کی اہم شخصیتوں پر قلم اُٹھانے کا ایک اہم مقصد شبلی کا یہ بھی تھا کہ اُردو کو علم و فن کے بیش قیمتی سرمایہ میں اضافا کیا جاسکے۔

اِس مختصر گفتگو سے یہ بات بالکل صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ سوانح نگاری پر اپنی گراں قدر خدمات کے دو مقاصد شبلی کے تھے پہلا یہ کہ مشاہیرِ اسلام کے احوال سے مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ کا اِحساس دلایا جائے، دوسرے یہ کہ زبان و ادب کے دامن کو وسیع کیا جائے، شبلی کی یہ خواہش تھی کہ نامواران اسلام کا تعارف اس طرح کرایا جائے کہ ان کے کارناموں کو دیکھ کر مخالفینِ اسلام مرعوب ہو کر اپنے اعتراضات پر خود شرمندہ ہو جائیں۔ اِس اہم مقصد نے شبلی کو سوانح نگاری کی قید آزاد کرا کے تاریخ نگاری تک پہنچایا کے اور وہ سوانح کے اصولوں سے واقف ہونے کے باوجود تاریخ نگاری کی وسعتوں میں داخل ہو گئے کیونکہ اِس کے بغیر اُن کا مقصد مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ شبلی نعمانی جدید سوانح کے فن، اصول اور حدود پوری طرح واقف تھے، چونکہ انھوں نے مغرب کی سوانح نگاری کے نمونے بھی دیکھ رکھے تھے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی اہم سوانحی تصانیف کا مختصر جائزہ لیا جائے۔

''المامون'' "1988" میں شائع ہوئی۔ یہ شبلی نعمانی کی اول تصنیف ہے۔ اس سے پہلے اردو میں حالی کی حیاتِ سعدی شائع ہوئی تھی جس کے بعد یہ جدید طرز کی دوسری سوانح عمری ہے۔ اس کتاب پر سرسیّد احمد خان نے مختصر دیباچہ لکھا ہے، اُس میں کتاب کی جس خصوصیت پر رشنی ڈالی گئی ہے، اِس کا انطباق صرف 'المامون' پر نہیں، بلکہ علامہ شبلی کی سبھی سوانحی کتابوں پر ہوتا ہے۔ جس عہد میں یہ کتاب شائع ہوئی اس عہد میں آزادء فکر کا جو ماحول تھا، بالخصوص مذہبی آزادی کی جو فضا چھائی ہوئی تھی، اُسے شبلی مغربی نقادوں کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

الزامات کا جواب تصور کرتے تھے اِسی لئے انہوں نے خلقِ قرآن کے فتنہ کو بھی نظرانداز کرکے مامون کو اسلامی ہیرو کے طور پر پیش کیا، حقیقت میں 'المامون' ایک سوانح عمری ہے باوجود اس کے اس میں بھی شبلی کا سوانحی انداز، تاریخی انداز سے بہت مماثل ہے، یہی وجہ ہے کہ 'المامون' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ نہ ہی مکمل تاریخ ہے اور نہ ہی مکمل سوانح ہے، شبلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اِس میں فن سے زیادہ مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی دوسری سوانحی کتاب ''سیرۃ النعمان'' یہ کتاب 1889 میں شائع ہوئی، علامہ شبلی نعمانی کو امام اعظم ابوحنیفہ سے بیحد تعلق خاطر تھا، اُسی قلبی تعلق کی بنا پر انھوں نے اپنا لقب نعمان رکھا تھا اور یہ اُن کے والد کے نام کا بھی جزو تھا، سید صاحب کے خیال کے مطابق یہی تعلق اور جذبہ 'سیرۃ النعمان' لکھنے کا باعث بنا ساتھ ہی ایک بڑا اہم محرک یہ بھی بنا کہ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے جو حقیقت پسندی، میانہ روی، اسلامی نظامِ قانون کو برسرِ کار لانے کے لئے شبلی ضروری سمجھتے تھے، اُس میں امام ابوحنیفہ کا طریقۂ کار معاون ثابت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 'سیرۃ النعمان' کا کلامی اور اصلاحی پہلو کافی اہم ہے، اگر ہم 'سیرۃ النعمان' کے دیباچہ کا 'المامون' کے دیباچہ سے موازنہ کریں تو اِس میں واضح فرق یہ نظر آتا ہے کہ مامون پر لکھتے وقت شبلی کا ارادہ 'رائل آف ہیروز' یعنی نامور فرماں روایانِ اسلام کا ایک سلسلہ رقم کرنے کا تھا لیکن 'سیرۃ النعمان' کے دیباچہ میں یہ ارادہ نامورانِ اسلام لکھنے میں تبدیل ہوگیا، اس تعلق سے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

> ''اُن کا شروع سے خیال تھا کہ سلطنت کے مختلف سلسلۂ نسب کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے جدا جدا خاندان قائم کئے جائیں اور اُن کے ناموروں کے حالات درج ہوں، اِسی مقصد سے اُنہوں نے فقہ کے بانی امام ابوحنیفہ کا انتخاب کیا۔ اِس سوانح کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کو مواد کی کمی نے کافی پریشان رکھا اور وہ ایسا مواد قلم بند کرنے پر مجبور ہوئے، جو نہ سوانح کے لحاظ سے مستحسن تھا، نہ تاریخ کے اعتبار سے معاون، پھر بھی شبلی نے زیادہ سے زیادہ مستند واقعات کا انتخاب کرکے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے، سوانح کے اوّل حصے میں ذاتی حالات اور شخصیت کا بیان ہے، دوسرے حصّے میں امام صاحب کے طرزِ اجتہاد اور اصول استنباط پر بحث کی گئی ہے، جو بقول شبلی اُن کی محنتوں کی ''تماشگاہ'' ہے، یہی کتاب کی جان اور مصنف کی علمیت، غور وفکر، سلیقۂ استدلال اور مشکل مسائل کو حل کرنے کی قابلیت کا شاہکار ہے۔

''الفاروق'' علامہ شبلی کی اہم تصنیف ہے جسے آپ نے 1899 میں لکھی، اس کی ابتدا مقدمہ سے ہوئی ہے، دراصل اس میں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور ان ادوار کی خصوصیات کے علاوہ مؤرخین کی

ISSN : 2582 - 3612

ذمے داریاں اور ان کے فرائض کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں یورپین مورخوں کی بے اعتدالی اور اسلام کے تعلق سے ان کے گمراہ کن نظریات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح پر عربی میں اور فارسی میں حتی کہ اردو میں بہت ساری کتابیں تصنیف کی گئی ہیں مگر باوجود ان سب کتابوں کے شبلی نعمانی کی تصنیف 'الفاروق' کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ کتاب بے نظیر اور لاثانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود علامہ شبلی کو بھی اس کتاب پر فخر تھا۔

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی تحقیق کے معتبر عالم تھے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو اس تعلق سے یہاں تک لکھا ہے کہ 'الفاروق' میں اُنہوں نے اصولِ صداقت کو برتنے میں کمالِ احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے، انہوں نے جتنی احتیاط اِس کتاب میں برتی شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ رکھی ہو، اِسی لئے مہدی افادی بھی 'الفاروق' کو عمروں کی کمائی قرار دیتے ہوئے کتاب کے اِس خاص وصف کو سراہتے ہیں۔ 'الفاروق' کو شبلی نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

اس کے پہلے حصّے میں حضرت عمر فاروقؓ کے حسب ونسب، ان کی پیدائش، سنِ رُشد، قبول اسلام اور ہجرت خلافتِ اسلامیہ کے لئے اُن کے انتخاب اور اُن کے عہد کی کامرانیاں اور فتوحات کا بیان ملتا ہے جب کہ اس کے دوسرے حصّے میں عہدِ فاروقی کی فتوحات کا جائزہ لیتے ہوئے فتوحات کے آسباب پر بھی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی حکومت کی نوعیت، ملک کی تقسیم، عہدیدارانِ سلطنت کے فرائض، رشوت سے متعلق دلچسپ معلومات، عدالت کی کاروائیاں، پولس اور فوجداری محکمہ کی کارکردگی کا بھی مفصل ذکر ہے۔ ساتھ اس کتاب میں اس عید کی تمام تر تفصیلات کو تذکرہ اس تفصیل اور جزئیات کی وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے پورا نقشہ نظر کے سامنے گھوم جاتا ہے کہ وہ عہد کیا رہا ہوگا، اس عہد کے لوگ کیسے رہے ہوں گے، اس عہد کا نظام کیسا تھا اور پھر یہ کہ حکومت وہ اسلامی اصول کے مطابق کس طرح چکائی جا رہی تھی ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ یہاں میں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح حضرت عمر فاروقؓ کی جامعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

> ''قانون فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے۔ ممکن بلکہ کثیرالوقوع ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن اور فضائل سے اِس کو بہت کم حصّہ ملا تھا۔ سکندر سب سے بڑا فاتح تھا لیکن حکیم نہ تھا، ارسطو حکیم تھا لیکن کشورستاں نہ تھا بڑے بڑے کمالات ایک طرف چھوٹی چھوٹی فضیلتیں بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اس اقتباس کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرا اقتباس بھی مطالعہ کا حصہ بنے تا کہ جس کو پڑھ کر حضرت عمرؓ کی سادگی ان کا جلال اور ان کی شان بے نیازی کا بھی اندازہ ہو سکے۔

''تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہیں جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں، کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو، فرشِ خاک پر پڑا رہتا ہو، بازاروں میں پڑا پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ وتنہا چلا جاتا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھوں سے تیل ملتا ہو، دردربارِ نقیب و چاوش حشم وخدم کے نام سے آشنا نہ ہو اور پھر بھی رعب وادب ہو کہ عرب وعجم اُس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس کی طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو، سکندر ہو یا تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے۔ جب اُن کا رعب قائم ہوتا تھا۔ عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا کچھ نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا۔''

مولانا شبلی نعمانی کا کمال اور اعجاز یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اسلوب نگارش، اپنے طرز تخاطب اور بیان کے اعجاز سے نہایت ہی خشک اور بے کیف موضوعات میں بھی لطف ولذت پیدا کر دی ہے جس سے ان کی نثر کا رنگ دوبالا ہو گیا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ شبلی نعمانی کے دل میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی جو حمیت اور اس کا ہاس تھا جس سے سرشار ہو کر انہوں نے 'المامون'، 'الفاروق'، 'سیرۃ النبی' جیسی بے مثال، بے نظیر اور بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔

Dr. Nasreen Bano
W/o.-Md. Murtaza Khan
C 10/10 Ziapura
Naya Pandariba
Chetganj
Varanasi-221010 (U.P.)

ڈاکٹر جاسمین آرا

اردو کی اہم خاتون افسانہ نگار: ذکیہ مشہدی

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی کا نام بہت ہی اہم اور معتبر ہے۔ حالیہ دنوں میں ساہتیہ اکیڈمی نے انہیں اپنے گراں قدر ایوارڈ سے نوازا ہے۔ گویا انہیں ناول آخری سلام'' کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے سال ۲۰۱۸ء کا ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ دیا گیا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اب تک درجنوں علمی وادبی کتابوں کے انگریزی' ہندی اور اردو ترجمے کئے ہیں۔ ان میں صرف ساہتیہ اکیڈمی کے لئے انہوں نے آخری سلام'' پکھیرو'' ''نیلا چاند'' اور ''لداخ کا سایہ'' جیسے ترجمے کئے۔

ذکیہ مشہدی چونکہ بنیادی طور پر علم نفسیات کی طالبہ رہی ہیں لہٰذا انہوں نے فکر وفن کے تعلق سے ہمیشہ ایک نیاز اویۂ نظر قائم کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ اس پر پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قائم بھی رہی ہیں۔ وہ ایک منفرد اور معتبر افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ زود گو بھی رہی ہیں لیکن انتخاب کے معاملے میں سخت گیر بھی۔ شاید یہی وجہ رہی کہ جس قدر انہوں نے لکھا اس کے مقابلے میں مجموعے کی شکل میں ان کا اثاثۂ فن کم کم ہی قارئین کے سامنے آیا۔ اب تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے ''پرائے چہرے''، ''تاریک راہوں کے مسافر'' ''صدائے بازگشت'' ''نقش ناتمام'' اور ''یہ جہانِ رنگ وبو'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان افسانوی مجموعوں کے حوالے سے ان کے فن کا ایک منفرد جہانِ رنگ وبو قارئین کے سامنے آیا ہے۔

ذکیہ مشہدی نے ۱۹۷۹ء سے لکھنا شروع کیا اور بہت ہی قلیل مدت میں اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ پوری اردو دنیا میں ایک منفرد افسانہ نگار کے طور پر ان کی شناخت ہوتی ہے۔ ہندو پاک کے معیاری رسائل وجرائد میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں اور بہت ہی ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر کے بعد ان کا نام سب سے زیادہ روشن ہوا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی ادبی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں :

''میرا خیال ہے کہ کامیاب افسانہ نگاری کے لئے حسّاس دل، وسیع تجربے اور الفاظ پر قدرت یہ تینوں ضروری ہیں۔ حسّاس دل تو میرے پاس ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لیکن تجربہ بہت وسیع نہیں ہے۔ جہاں تک الفاظ کا سوال ہے اس کا فیصلہ قارئین پر ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ ان ان تک پہنچ سکا ہے یانہیں، اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔ ویسے یہ بتادوں کہ میں دانستہ طور پر پلان بنا کر یا سوچ سمجھ کر کبھی نہیں لکھتی ۔ جب ہی لکھا ہے جب دل کسی واقعے یا کیریکٹر سے بہت متاثر ہوا ہے اور جس کے متعلق دوسرے کو بتانے کو دل چاہو کہ ایسا بھی ہوتا ہے اور لوگ یوں بھی جیتے ہیں۔''

جہاں تک تجربے اور لفظوں کا سوال ہے تو اسے ذکیہ مشہدی کی انکساری و خاکساری سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ ذکیہ کہانی کہنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ربط و تسلسل ہوتا ہے جو قاری کو باندھے رکھتا ہے اور اختتام پر اسے ایک خوشگوار تاثر کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی عورت، اس کے معاشرے اور اس کے روزمرہ کے گزرتے لمحات کو صحیح ادبی تناظر میں کمال فنکاری سے پیش کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف خواتین کی نفسیاتی گھتیوں کو سلجھاتی ہیں بلکہ اپنے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کرنے میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں تجسّس کی فضا بھی ملتی ہے۔ قاری بے چین رہتا ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے ان بابت ٹھیک ہی لکھا ہے کہ :

''ذکیہ مشہدی کہانی لکھنے کا آرٹ فطری طور پر جانتی ہیں۔ کردار کے عمل دخل نیز ان کے مکالمات، ماجروں اور وقوعوں اور بیچ بیچ میں ابھرنے والے منظروں کے ذریعہ ذکیہ مشہدی بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنا Contect پیش کر دیتی ہیں کہانیاں لکھتے وقت ان کے سامنے نظریات و فلسفہ کا نہ کوئی نصاب ہوتا ہے، نہ درس حکمت اور اخلاق و اقرار کی کشاکش ہوتی ہے۔''

ذکیہ کا حسّاس دل ملک کی سیاسی صورت حال، معاشی بے اطمینانی، مسلم گھرانوں کے مسائل، مذہبی و مسلکی اور فرقہ وارانہ صورت حال سے تڑپ اُٹھتا ہے تو وہ ''منظورو ا'' اور ''دوسری ہجرت'' جیسی کہانی لکھتی ہیں جس میں بابری مسجد کی شہادت اور فرقہ وارانہ فسادات کا پورا منظر نامہ ابھرتا ہے۔ وہ اپنی ان کہانیوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کی بھی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے :

''دنیا بہت پیچیدہ ہوگئی تھی۔ قدرت نے بہت سادہ بنایا تھا۔ پیٹ بھرو، سر پر چھپر ڈالو سر ڈھکو، جیو اور دوسرے کو جینے دو، مگر وہ تو ایسی پیچیدہ ہوگئی جیسے محبوب کی زلفیں، بکرے کا آنتیں یا پھر اون کا بڑا سا گولا جسے کتّوں نے کھیلتے کھیلتے الجھا دیا ہے۔ سراج کے اپنے ذہن میں بگولے چکّر کاٹنے لگے

تھے۔ وہ شہاب کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے خود سوچنے لگتا کہ قطعی اور حتمی کیا ہے؟ مذہب یا تقسیم یا شخصی و اجتماعی اقتدار یا محض زور آور اور کمزور کا موٹا احتجاج۔''

ذکیہ مشہدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پرائے چہرے'' جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا جس میں ۱۵/افسانے ''چرایا ہوا سکھ''، ''تھکے پاؤں جگنو''، ''ایک تھکی ہوئی عورت''، ''پرائے چہرے''، ''پائل''، ''آنٹی ایملی''، ''نروان'' وہ ایک صبح''، ''مٹھی بھر گھاس''، ''شکستہ پروں کی اُڑان''، ''کالے میگھا پانی دے'' ''تیری راکھ''، ''ٹوٹا ہوا خط'' اور ''کاغذی رشتہ'' شامل ہیں۔ میرے مطالعے کی رو سے زیر نظر مجموعہ میں'' تھکے ہوئے پاؤں'''' پرائے چہرے'' ''وہ ایک صبح'' ''ٹوٹا ہوا خط'' اور ''پائل'' ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ اس مجموعے میں ذکیہ مشہدی صاحبہ نے زیادہ تر رشتوں پر مبنی کہانیوں کو شامل کیا ہے۔ کہیں شوہر بیوی کا رشتہ ہے تو کہیں ماں اور بیٹے بیٹیوں کا۔ کہیں عاشق اور محبوب کا رشتہ ملتا ہے۔ تو کہیں امیری اور غریبی کا۔ ذکیہ مشہدی مسائل کو جانتی ہیں اور انہیں کہانیوں میں پرونے کا فن بھی معلوم ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے جسے پڑھتے وقت قاری کا تجسس قائم رہتا ہے۔ ذکیہ مشہدی نے ان کہانیوں میں عورتوں اور صنف نازک کے مسائل کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

ذکیہ مشہدی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''تاریک راہوں کے مسافر'' دسمبر ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں کل ۱۳/افسانے ''ہر ہر گنگے'''' میراث'''' سرورق کے چہرے'''' پرسش'''' تاریک ''راہوں کے مسافر'' ''لاٹھیوں والے'' اور ڈاگڈر دیوتا'' اس مجموعے کے نمائندہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ ''ہر ہر گنگے'' موضوعاتی اعتبار سے نہایت کامیاب افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں پسماندہ اور دولت برادری کے ایک ایسے انسان کے زندگی کے چند لمحوں کو قید کیا ہے جو غربت کی وجہ سے چند سکّے بٹورنے کے لئے سمندر میں کود پڑتا ہے۔ مصنّفہ کا یہ افسانہ ''ایک مکوڑے کی موت'' کے متوازی کھڑا نظر آتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''صدائے بازگشت'' ہے۔ جس کی اشاعت ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ اس میں ۱۴/کہانیاں ''اجن ماموں کا بیٹھکہ'''' افعی'' ایک مکوڑے کی موت'''' بھیڑیے'''' قشقہ'' فدا علی'''' کریلے اور اردو'' بی بی نیاز'''' حصار'''' حجو'' صدائے بازگشت'''' ان کی عید'' شانو کا سوال'' اور ''قصّہ جانکی رمن پانڈے'' شامل ہیں۔ اس مجموعہ کے افسانے قبل کے افسانوی مجموعے کی نسبت زیادہ معیاری اور فنّی ہیں۔ سیاسی مسائل پر ان کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہاں ہندوستانی سماج میں دولتوں اور مظلوموں کے ساتھ ہو رہے ظلم و زیادتی کو بھی قلم بند کرنے کی کاوش کی ہے اور اس کے ساتھ ہی

ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور فرقہ وارانہ فسادات کی تصویر کشی کی ہے۔تو کہیں ماں کے ایثار و قربانی کو آشکار کیا ہے۔اس کے زیادہ تر افسانے اپنے موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے شاہکار افسانے کہے جاسکتے ہیں ۔اس مجموعہ کے بہترین افسانوں میں ''ایک مکوڑے کی موت'' ''حصار'' ''بھیڑیے'' ''افعی'' ''اجن ماموں کا بیٹھکہ'' ''فدا علی'' ''کریلے اور اردو'' صدائے بازگشت'' ''ان کی عید'' ''قصّہ جانکی رمن پانڈے'' قابل ذکر ہیں۔افسانہ ''ایک مکوڑے کی موت'' اور ''بھیڑیے'' میں ترقی پسندی ملتی ہے۔ان افسانوں میں فن اپنی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔افسانہ ''ایک مکوڑے کی موت'' میں سماج کی حقیقت کو بڑی سفّا کی سے بیان کیا گیا ہے۔اس کا مرکزی کردار ''دھنیا'' نام کا ایک مرد ہے۔جو دلت طبقہ کا ہے اور اس طبقے کے زیادہ تر انسان چوہے کھا کر اپنے پیٹ بھرا کرتے ہیں۔اس قوم کی پستی کا یہ عالم ہے کہ دھنیا کے دس سالہ بیٹے نے کبھی پوری سبزی نہیں کھائی تھی، دیکھی تک نہیں تھی۔

افسانہ ''بھیڑیے'' میں دو مسئلوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ایک سماج میں اونچ نیچ کا مسئلہ اور دوسرا عورتوں پر کھلے عام ہونے والا ظلم و استحصال ۔افسانے کا مرکزی کردار ''کرملی'' نام کی عورت ہے جو اونچی ذات کے لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں معنویت اور سچائی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ان کے افسانوں میں اپنائیت اور مانوسیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہانیوں کے موضوع اور ان کے مرکزی خیالات ،فلسفہ اور منطقی بحثوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ساتھ ہی ان میں بڑی افسانہ نگاروں والی کیفیات موجود ہیں جو عصمت ،قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو کی صف میں لا کر انہیں کھڑا کر دیتی ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد انسانی فکر و عمل کا دائرہ محدود نہ ہو کر پھیل جاتا ہے۔اور قاری کو فکر کی دعوت دیتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''نقش نا تمام'' ہے جو ۲۰۰۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔اس میں ۱۵؍افسانے ''ہدّ و کا ہاتھی'' ، ''بوئے سلطانی'' ، ''فضلو بابا ٹخ ٹخ'' ، ''تھوڑا سا کاغذ'' سارے جہاں سے اچھا'' ، ''نیا سال مبارک ہو'' ، ''بلی کا بچہ'' ، ''چھوٹے چچا'' ، ''منظور وا'' ، ''نتھو ، بدھو ، خیراتی کو گھن آتی ہے'' ، ''گلی سرمست میں رمضان'' ، ''چھوٹی ریکھا بڑی ریکھا'' ، ''محمود و ایاز'' ، ''باقی سر'' ، ''لپا گو'' ''بھیڑیے سیکولر تھے'' شامل ہیں۔اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں موضوعاتی اعتبار سے بہت کامیاب ہیں۔ افسانہ ''ہدّ و کا ہاتھی'' اور ''بوئے سلطانی'' میں ذکیہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی تہذیب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔وہیں اپنی کہانی ''منظور وا'' اور ''نیا سال مبارک ہو'' بابری مسجد کی شہادت جیسے حساس معاملے کو مندرج کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔افسانہ

''محمود و ایاز'' کے ذریعہ ذکیہ مشہدی نے مسلمانوں میں در آئی اونچ نیچ کے مسئلہ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ فسانہ ''لپا گو'' میں نئی جنریشن میں آئی تبدیلی کو موضوع بنایا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا کینوس بڑا ہوتا ہے ۔یہ اپنے پہلے کے افسانہ نگاروں مثلاً عصمت چغتائی ،قرۃ العین حیدر ، بیدی، کرشن چندر ، منٹو جیسے فنکاروں کی روایت کو برقرار رکھتی ہیں ۔ان کے موضوعات سماجی ، سیاسی ، اقتصادی ، معاشرتی ، تاریخی و تہذیبی ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ان کی فکر میں گہرائی و گیرائی ہے اور مسائل کے بیان کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں غیر جانبدارانہ رویّہ اپناتی ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی لکھتے ہیں :

> ''ذکیہ مشہدی ایک اہم افسانہ نگار ہیں ۔جنہوں نے اپنے افسانے ''پرائے چہرے'' ''تاریک راہوں کے مسافر'' صدائے بازگشت'' وغیرہ کے ذریعہ بڑے سلیقے سے انکشاف حقیقت کا فرض ادا کیا ہے ۔ان کا بھی تعلق کسی تحریک یا جماعت سے نہیں رہا۔چنانچہ خود اپنی فہم و فراست سے اپنی منزل کا تعین کیا ہے ۔زندگی کی آلودگی ، ناہمواری ، استحصال وغیرہ سے مسلسل برسر پیکار رہ کر اپنی سماجی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان کے یہاں اتھاہ انسانی دردمندی قاری کے دل پر بے حد اثر انداز ہوتی ہے ۔وہ مرد اساس معاشرہ میں مردوں کے خلاف گرچہ آواز نہیں اٹھاتیں لیکن عورتوں کے تئیں ان کے ناروا سلوک کو انگیز کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔کرداروں کے ذریعہ واقعات کو نمایاں کرتی ہیں ۔زبان اور بیانیہ کی پیچیدگی سے گریز کرتے ہوئے فطری انداز سے کہانیاں لکھتی ہیں جن میں وحدت تاثر بھی ہوتا ہے۔''

قاضی عبید الرّحمٰن ہاشمی کے ان خیالات سے الگ اردو افسانہ نگاری کے موجودہ منظر نامے کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذکیہ مشہدی کو وہ مقام حاصل ہو چکا ہے جو کسی بھی فن کار کے فن کی معراج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ذکیہ مشہدی نے اپنے فن کے ذریعہ اردو افسانے کو ایک ایسی کائنات فن عطا کی ہے جو ناقابلِ فراموش ہے۔

Dr. Jasmin Ara
Pugmil Road No-07
Alfalah Colony
Hazaribagh

استخار عالم

دردؔ دہلوی کی شعری خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

محمد دلشاد المتخلص دردؔ دہلوی اسّی کے بعد جو قافلہ منزلِ ادب کو پانے کے لیے نکلا اسی قافلے کے (عصری اعتبار سے) ایک رکن ہیں۔ اس قافلے میں ایک گروہ وہ تھا جو جدیدیت کی طرف کبھی کبھی جھانک لیتا تھا تو کبھی کبھار ترقی پسندیت کے دریچے جس سے نجات کے لیے کھول لیتا تھا۔ دراصل یہ گروہ نہیں تھا یہ فن کا ایک غیر منصوبہ بند اجتماع تھا مگر اس اجتماع کے افراد اقلیت میں تھے۔ اکثریت میں وہ گروہ تھا جو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت پسند رجحان کا مخالف تھا۔ یہ کلاسیکی ادب و اقدار کا از سرِ نو احیا کرنے کا خواہاں تھا۔ دردؔ دہلوی اسی جماعت سے مزاجی ہم آہنگی رکھتے ہیں مگر وہ کسی ادبی گروہ یا جماعت کے مقلد نہیں ہیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل آزاد منش ہیں۔ وہ اتباع کی بجائے استفادہ سے کام لیتے ہیں۔

دردؔ دہلوی نے کئی شعری اصناف مشقِ سخن کا نمونہ پیش کیا ہے مثلاً حمد، نعت، غزل، نظم، منقبت، کلامِ سحر وغیرہ۔ مگر ان کی فکر اور ان کا فن غزل اور نعت میں زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ فن میں خیال روح کی طرح سرایت کیے ہوتا ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا ہے مگر اس کی موجودگی کا احساس ہمہ دم ہوتا ہے۔ اسی لیے سبھی ناقدین اسے تسلیم کرتے ہیں کہ راست پند و نصیحت اور وعظ و خطاب سے شاعری کا فن مجروح ہوتا ہے۔ یہ کام ناصح، واعظ اور خطیب کا ہے۔ شاعر تو بس آئینہ دکھاتا ہے، وہ عکس پر نہ تو تبصرہ کرتا ہے اور نہ عکس کی صحت کے لیے کسی طرح کی تلقین کرتا ہے۔ شاعری تبلیغ کا پلیٹ فارم بھی نہیں ہے۔ البتہ ایسے مشن کا کام اشاروں، کنایوں اور استعاروں سے لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ برہنہ فکر شاعری کو راس نہیں آتی ہے۔ دردؔ دہلوی کی غزلوں کے اسلامی، اصلاحی اور تبلیغی افکار و خیالات جب تک ان کی طبیعت اور شخصیت کے تابع رہتے ہیں، ان کی غزلیں سپاٹ پن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کی متن خوانی سے اکثر نہ تو زبان کو لذت و لطافت کا احساس ہوتا ہے اور نہ سماعت پر صوت کی نرمی و گداز پن محسوس ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت موصوف کی ساری غزلوں کی نہیں ہے۔ جن غزلوں کی زمین سنگلاخ ہے ان میں یہ فنّی عاریت نمایاں طور سے نظر آتی ہے مگر جن غزلوں کی زمین رواں ہے جن کے قوافی نغمہ آمیز ہیں اور جن کی ردیفیں نرم و سبک ہیں ان میں شعریت و تغزل بدرجہا بہتر ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں فن کی ایسی خوش گواری ریگستان میں نخلستان کی طرح جاں بخش، راحت

ISSN : 2582 - 3612

افزا اور سکوں آمیز نظر آتی ہے۔ معجزہ؟ فن کی نمود خونِ جگر کی آبیاری سے ہوتی ہے بقول اقبالؔ ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ ؟ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

دردؔ دہلوی جس معیار کے غزل گو ہیں اس سے کہیں زیادہ بلند معیار کے نعت گو ہیں۔ ان کی غزلوں کی تعداد حالانکہ سینکڑوں ہیں اور نعتوں کی تعداد اس کی ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں ہے لیکن معیار کے آگے مقدار کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ غزل گوئی کے معاملے میں دردؔ دہلوی نے روایت سے روایت کا سفر ضرور کیا مگر اس میں کلاسیکی روایت کا جمالیاتی حسن مفقود ہے۔ اس کے برعکس ان کی نعتوں میں روایت سے درایت کی سمت سفر نظر آتا ہے۔ ان کی نعتوں میں مولویت کی بجائے غزلیت کی ترنم ریزی اور ترنم خیزی کی لہریں نظر آتی ہیں۔ عصری مقبولیت انھیں غزلیں دلا سکتی ہیں مگر دیرپا مقبولیت کی حامل ان کی نعتیں بنیں گی۔ حالانکہ انھیں اپنی غزل گوئی پر ناز ہے جیسا کہ غالبؔ کو اپنی فارسی غزل گوئی پر فخر تھا مگر ان کی ابدیت کی ضامن ان کی اردو غزلیں بنیں۔

بہرکیف دردؔ دہلوی کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار نظر آ جاتے ہیں جو خاصا اپیل رکھتے ہیں۔ کئی اشعار میں طرزِ فکر اور طرزِ اظہار یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ چونکنا پڑتا ہے اور انھیں ٹھہر کر پڑھنا پڑتا ہے۔ ایسے اشعار بھلے ہی کم ہیں مگر غزل کی سرگم ہیں ؎

سورج اٹھائے پھرتا رہا سر پہ اس لیے
میرے بدن سے میرا ہی سایہ بڑا نہ ہو

کہتے ہیں بے خودی کسے، ہم کو نہیں خبر
تم سے ملے تو دنیا سے رشتہ نہیں رہا

منظر تمام جلنے لگے ہیں بہار کے
کیوں چھیڑ بیٹھے تذکرہ اس شعلہ بار کے

رخصت اسے تو کرنا تھا حالات کے تحت
کیسے گزاری جائے گی شب، جانتے ہیں ہم

ہم اہلِ ہجر حقیقت بتا نہیں سکتے
سنا تو ہے کہ چمن سے بہار گزری ہے

دردؔ دہلوی کے اب شعر بھی معمہ ہیں
واہ اردو والوں کیا سخن شناسی ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لفظ شعروں میں چاہے جیسے ہوں
اہمیت تو خیال کی ہوگی

مذکورہ اشعار میں غزل کی غایت فنّی خوبیاں آشکار ہو رہی ہیں۔ صرف آخری دو اشعار محلِّ نظر رہے۔ دردؔ دہلوی کو حیرت ہے کہ اب ان کا شعر بھی معمہ ہو گیا ہے جب کہ اس میں معنی کا اکہرا پن ہے اور راست خیالی ہے۔ غالباً کہیں معنی کی جو پیچ بستگی اور دبازت ہے وہ عام قاری و سامع کے لیے معمہ بن جاتی ہوگی۔ اس کا آخری شعر دردؔ کے نظریہ؟ فن کے ساتھ ساتھ نظریہ؟ مقصد کو پیش کرتا ہے۔ دردؔ کی نظر میں شاعری کے لیے فکر و خیال زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ فن اور لزوماتِ فن نہیں۔ اسی سوچ اور نظریہ نے ان کی شاعری میں الفاظ کی شیرینیت، سڈول پن، نرم روی، حلاوت، استعارہ و معنوی اشارہ کو کم کر دیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ عناصرِ غزل ہیں جو شاعری میں حسن معنی اور حسنِ فن دونوں کو پیدا کر دیتے ہیں۔ فن پر خیال کو قربان کرنا فن کی اہمیت سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین یہ نہیں دیکھتے کہ ''کیا کہا'' ہے بلکہ یہ تلاش کرتے ہیں کہ ''کیسے کہا گیا'' ہے۔ اسی لیے فن کی قدر شناسی اور قدر دانی کرنے والے نقاد فن کو مقدم اور فکر کو مو؟ خر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی یہ دلیل ہوتی ہے کہ فن کا اظہار ہوگا تو فکر حصۂ فن از خود ہوگا۔ یہ فکر کبھی زیریں لہروں کی صورت میں ہوتی ہے تو کبھی الفاظ کے پور پور سے مثلِ شبنم ٹپکتی رہتی ہے۔ اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اہمیت خیال کی ثانوی حیثیت کی تو ہو سکتی ہے مگر الفاظ کی حیثیت خیال سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔ جیسے تیسے الفاظ شاعری کو عموماً اور صنفِ غزل کو خصوصاً راس نہیں آتے ہیں۔ اس کلیّہ کو سبھی ناقدین تسلیم کرتے ہیں کہ ہر صنف کی اپنی مخصوص لفظیات ہوتی ہے۔ اس سے زبان و بیان کا حسن فطرتاً فزوں تر ہوتا ہے۔ لہٰذا دردؔ دہلوی کو اپنا نظریہ؟ فن بدلنا ہوگا تاکہ ان کی غزلیں فکر و فن کی خوب صورت امتزاج پیش کر سکیں۔

الختصر یہ کہ دردؔ دہلوی اپنے سیلِ فکر کو فن کے بہاؤ کے ساتھ مدغم کر دیں تو موصوف کی غزلیں فنّی کسر سے پاک ہو جائیں گی۔

نہ سیاہی کے ہیں دشمن، نہ سپیدی کے ہیں دوست
ہم کو آئینہ دکھانا ہے، دکھا دیتے ہیں

Istakhar Alam
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
J. P. University
Chapra (Bihar)

ISSN : 2582 - 3612

ساجد علی

پروفیسر محمد حسن کی حیات و خدمات: پر اِک نظر

اردو ادب میں رومانوی رجحان کا غلغلہ ایک عرصہ تک چھایا رہا جس کے تحت 'ادب برائے ادب' کا خیال عام تھا۔ اس میں ادب کے افادی پہلو کو نظر انداز کر کے حصول مسرت کو ہی سب کچھ مان لیا گیا تھا۔ جہاں ادب کو زندگی اور اجتماعیت کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے ذوق سلیم کو ادب اور فن کے پرکھنے کا معیار مقرر کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے سر سید تحریک کے طور پر ایک اہم تحریک ابھر کر سامنے آئی تھی، جس میں اصلیت، سادگی اور قوم و ملت کے مسائل کو بنیاد بنایا گیا۔ اردو ادب میں رومانوی رجحان کے بعد ترقی پسندی کا دور آیا۔ علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک سب سے اہم تحریک تھی۔ اردو ادب کو زندگی کے قریب لانے، زندگی کا عکاس و ترجمان بنانے اور اسے تنقید حیات کا درجہ دینے میں ترقی پسند تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو قومی و بین الاقوامی پیمانے پر جبر و استبداد، غریبوں کے استحصال اور اور دبے کچلے ہوئے لوگوں کی حالت زار کے ردعمل میں اٹھنے والی تحریکوں نے جنم دیا۔ اس وقت ساری دنیا میں یہ احساس عام ہوا کہ شاعر و ادیب بھی اپنے سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں، اس لئے ظالم و مظلوم کی جنگ میں وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے انہیں بھی اپنا فرض نبھانا چاہئے۔ 1935ء میں دنیا بھر سے ادیب پیرس میں جمع ہوئے جس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے بھی شرکت کی۔ اس طرح لندن میں قیام پذیر ہندوستانی نوجوان طلبہ کے ایک گروہ نے ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی، جس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کے ساتھ ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر دین محمد تاثر بھی شامل تھے۔ لندن میں اس تحریک کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں بھی ترقی پسند انجمن قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جس کے تحت ہندوستانی ادبا و شعراء کو اس تحریک سے روشناس کرایا گیا۔ 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جس میں ادب کا رشتہ زندگی سے جوڑنے، محنت کشوں کی حمایت کرنے، تعصّب، فرقہ پرستی اور انسانی استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کا عزم کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی تائید کی۔ پریم چند نے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ اس تحریک نے یوں تو تمام ادبی اصناف کو متاثر کیا لیکن فکشن، شاعری اور تنقید کو خاص طور سے متاثر کیا۔ پریم چند، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

انصاری، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ نے افسانہ وناول کے ذریعہ علی سردار جعفری، جوش، فیض، مجروح، مجاز، مخدوم اور جذبی وغیرہ نے شاعری کے ذریعہ تو مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر حسین رائے پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، خلیل الرحمن اعظمی، ممتاز حسین اور قمر رئیس وغیرہ نے تنقید نگاری کے ذریعہ ترقی پسند تحریک کو فکری اساس بخشنے اور ادب میں مارکسی نظریات کی تشریح وتفہیم کا فریضہ انجام دیا۔ ترقی پسند تحریک 20ویں صدی کی سب سے بڑی اور مؤثر تحریک ہے۔ جس نے ایسے ادب کی تخلیق کرنے پر زور دیا جو پورے معاشرے کا آئینہ دار اور آزادی و جمہوریت کا علم بردار ہو۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ جماعت میں ایک اہم نام پروفیسر محمد حسن کا ہے۔ محمد حسن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن اتر پردیش کے صنعتی شہر مرادآباد کے محلّہ 'نواب پورہ' میں 20اگست/1926ء میں پیدا ہوئے۔ محلّہ 'نواب پورہ' انہیں کے آباواجداد کا بسایا ہوا ہے۔ ان کے والد کا نام محمد الطاف حسین اور والدہ کا نام رضوان فاطمہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم مرادآباد سے حاصل کرنے کے بعد بی۔اے۔اور ایم۔اے۔ اردو اوّل درجہ سے لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کے اہم اساتذہ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، سید احتشام حسین اور نورالحسن ہاشمی تھے۔ یہیں سے 1952ء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نگرانی میں اپنا پی ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ مکمل کیا جس کا موضوع 'لکھنؤ کی ادبی خدمات' تھا۔ تعلیمی سفر کے دوران تلاش روزگار کا مسئلہ کھڑا ہوا تو 1950ء میں لکھنؤ سے نکلنے والے انگریزی اخبار روزنامہ 'پائنیر' میں بطور معاون اڈیٹر شروعات کی۔ 1953ء میں 'پائنیر' کے 15 روزہ رسالے 'فلم میل' کے مدیر ہو گئے۔ اسی دوران لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں عارضی طور پر لیکچرر بھی رہے۔ اس کے بعد 1963ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر رہے۔ 71-1963ء تک دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دئے پھر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں 75-1971 تک پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ 1975ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے پروفیسر کی حیثیت سے انہیں مدعو کیا اور 1991ء میں وہ اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں اِس یونیورسٹی کا 'پروفیسر آف ایمرٹس' مقرر کر دیا گیا۔ اپریل 2010ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا اور دہلی گیٹ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اردو زبان وادب کو بین الاقوامی سطح پر آبرو دلانے کا جو ان کا خواب تھا وہ صرف خواب ہی نہیں رہا، بلکہ اس خواب کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے تنقید، تحقیق، فکشن، ڈرامہ، شاعری اور صحافت جیسے مختلف النوع میدان میں طبع آزمائی کی اور اس میں کامیاب رہے۔

محمد حسن نے اپنے رفیقوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن 'حلقہ احباب' کی بنیاد ڈالی۔ جس کی

ISSN : 2582 - 3612

صدارت احتشام حسین صاحب کیا کرتے تھے۔ 'حلقہ احباب' کے جلسے باقاعدگی سے 46-1942 تک ہوتے رہے۔ جس میں جملہ اصناف پر تنقیدی مقالے اور معلوماتی مضامین کو اہمیت دی جاتی تھی۔ 'حلقہ احباب' کی فضا اور احتشام حسین صاحب کے علمی تجربہ نے محمد حسن کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کی اہم تصانیف "ادبی تنقید"، "اردو ادب میں رومانوی تحریک"، "شعر نو"، "دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر"، "جدید اردو ادب"، "عرض ہنر"، "ہئیتی تنقید"، "شناسا چہرے"، "مارکسزم اور ادب"، "معاصر ادب کے پیش رو"، "ادبی سماجیات"، "قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ"، "ادبیات شناسی"، "مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ"، "ہندی ادب کی تاریخ"، "غالب (ماضی، حال اور مستقبل)"، "طرز خیال" کے علاوہ "جلال لکھنوی"، "مطالعہ سودا"، "انتخاب سراج"، "انتخاب میر" وغیرہ ہیں۔ ان کے تنقیدی نظریات میں انتہا پسندی کے بجائے توازن اور اعتدال نظر آتا ہے۔

محمد حسن نے ریڈیو فیچر، ریڈیائی ڈرامے، اسٹیج ڈرامے اور ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا۔ 1950ء میں انہوں نے "یہ لکھنؤ ہے" نام سے ایک ریڈیو فیچر لکھا۔ دوسرے ریڈیائی فیچرس میں "نقش فریادی" اور "اکبر اعظم" اہم ہیں۔ ریڈیو ڈراموں میں ان کا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائی" کے کل 9اور "مور پنکھی اور دوسرے ڈرامے" کے 3 ڈرامے ریڈیائی ہیں۔ مجموعہ "میرے اسٹیج ڈرامے" کے سبھی 6اور "مور پنکھی اور دوسرے ڈرامے" کے 4 ڈرامے اسٹیج ڈرامے ہیں۔ "کہرے کا چاند"، "تماشا اور تماشائی" اور ملک میں ایمرجنسی کے حالات پر لکھا گیا ڈرامہ "ضحاک" کو مکمل ڈراموں کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ایک منظوم ڈرامہ "عمر خیّام" کے نام سے ہے۔ "اردو ڈراموں کا انتخاب" اور "نئے ڈرامے" بھی مجموعے ہیں۔ آپ کے ڈرامے کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کئے جا چکے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ہی "اردو تھیٹر" نام سے ایک ڈرامہ گروپ بھی قائم کیا جس کے بینر تلے مختلف شہروں میں کئی ڈرامے اسٹیج کئے گئے۔

محمد حسن نے شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو ادب کو دو شعری مجموعے "زنجیر نغمہ" اور "خواب نگر" کے نام سے دئے۔ ان مجموعوں میں شامل نظموں کے موضوعات پر غور کیا جائے تو اکثر نظموں میں محمد حسن کے سیاسی افکار نظر آتے ہیں۔ غلامی، استحصال، ظلم اور جبر اور اُس وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے محمد حسن کے انداز فکر اور فلسفیانہ حسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناول نگاری کے میدان میں ان کا پہلا ناول "زلفیں زنجیریں" اور دوسرا ناول "غم دِل وحشت

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

دِل" ہے۔"زلفیں زنجیریں" کوانھوں نے 'منظرسلیم' کے نام خطوط کی شکل میں لکھا تھا جبکہ "غم دِل وحشت دِل" سوانحی طرز کا ناول ہے جس میں محمد حسن نے اپنے دوست 'اسرارالحق مجازؔ' کی زندگی اور حالات کو پیش کیا ہے۔اس ناول کوسوانحی طرز کے ناول کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔

صحافت کے میدان میں انہوں نے انگریزی اخبار روزنامہ "پائنیر "اور 15 روزہ فلمی رسالے "فلم میل" سے جڑے رہنے کے بعد ایک سہہ ماہی جریدہ "عصری ادب" کے نام سے جاری کیا جو 20 سالوں تک جاری رہا۔اس رسالہ کی خصوصیت یہ تھی کہ ترقی پسند ادب پر جب جدیدیت پسند نقاقوں کے حملوں اور مخالفت کا دور شروع ہوا تو ان کے سامنے متوازن اور سنجیدہ اسلوب میں آواز بلند کی اور ترقی پسندوں کو مجتمع کیا۔

اس علمی سفر کے دوران انہیں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔جس میں "نہرو فیلوشپ ایوارڈ "،"اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ"،"دہلی اردو اکادمی ایوارڈ"،"مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ"،" آندھر پردیش ساہتیہ اکادمی ایوارڈ"،"ساہتیہ پریشد ایوارڈ"،" کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ"،اور "اقبال سمان" جیسے ایوارڈ شامل ہیں۔انہیں اس بات کا کوئی رنج نہیں ہے کہ معاصرین جتنی شہرت انہیں نہیں ملی۔

محمد حسن نے اپنے علم کو کسی ایک خاص دائرہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر میدان میں کامیاب تجربے کئے۔خواہ وہ تحقیق وتنقید کا میدان ہو،فکشن نگاری ہو یا پھر قدیم ادب کی بازیافت کا معاملہ،محمد حسن دیگر ترقی پسندوں سے منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔انسانی زندگی میں ادب کی افادیت کے ساتھ انہوں نے ادب کی جمالیاتی قدروں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔مشرقی ادب کے ساتھ مغربی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔وہ ایک کثیر المطالعہ اور وسیع النظر انسان تھے جس کے سبب تنقیدی نظریہ کے ساتھ فلسفیانہ بصیرت بھی رکھتے تھے۔انہوں نے زندگی اور سماج سے ادب کے گہرے تعلق پر روشنی ڈالی لیکن ادب کو کسی تنگ دائرہ میں قید کرنے کے قائل نہیں رہے۔محمد حسن اپنی بات کو مدلّل انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ان کی نثر کی روانی اور دلکشی ہمیں متوجہ کرتی ہے۔

Sajid Ali
Research Scholar
Deptt. of Urdu
C.C.S. University
Meerut (U.P)

محمد وسیم الدین

ترقی پسند اردو شاعری:ایک جائزہ

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری اہم اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظّم تحریک تھی،جس کی کوششیں شعوری اور مقصد واضح تھا۔ادب لطیف کے رجحان اور حسن پرستی کی شدت کے خلاف یہ ایک طرح کا شدید ردِعمل تھا۔اس تحریک نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت،مادیت اور اجتماعیت کو ایک نئی شکل دی،علیگڑھ تحریک کے افادی اور مقصدی ادب کے نکتہ نظر کو جدلی مادیت یا اشتراکی اور سوشلسٹ نظامِ فکر سے جوڑ دیا گیا۔فطرت پرستی کے رجحان میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا گیا اور ان تمام قدیم اور بعض فرسودہ قدروں سے بغاوت کا اعلان کیا گیا جو ترقی پسند نہیں تھیں۔علی گڑھ تحریک میں بغاوت کا رجحان مدہم تھا،مگر اس تحریک سے ہر وہ شخص وابستگی محسوس کرنے لگا جو کسی نہ کسی جہت سے سماج،سیاست،مذہب اور ادب کے پرانے نظام فکر سے باغی تھا۔اس کی روبغاوت آہنگ تھی۔دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔اگرچہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا،مگر بہت جلد یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی انقلاب تھا،لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک نے اردو شعروادب میں نئے آہنگ کا اضافہ کیا۔انہوں نے اقبال سے فکر کی صلابت، حیات بخش لب ولہجہ اور شعر میں نظرئے کی تپش کا انداز لیا اور ان کے یہاں ایک طرح کی جورومانی جذباتیت یا عشق کی سرمستی تھی۔اس سے استفادہ کیا،لیکن وہ اقبال کی فکر کی بلندی اور فلسفے کو شعر بنانے کی قدرت سے محروم رہے۔فکری گہرائی کی کمی کو انہوں نے جوش کی خطیبانہ بلند آہنگ اور گھن گرج والی شاعری سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ان کے نغموں اور نظموں نے ملک میں بڑھتے ہوئے تحریک آزادی کے جوش کو بڑھاوا دیا اور سامراج مخالف ولولوں کو ہوا دے کر شعلہ جوالہ بنا دیا۔ان میں بہت سے شاعر جو ابتدا میں آگ وخون کی بات کرتے رہے۔بعد میں سنبھل گئے اور اردو شاعری میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ترقی پسندوں میں ابتدا ہی میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے شاعروں میں مجاز،مخدوم،جذبی اور علی سردار جعفری قابل ذکر ہیں۔فیضؔ ابتدا ہی سے ایک دھیمے لب ولہجے اور کسی حد تک رموز وعلائم میں گفتگو کرنے والے شاعر تھے۔جماعتی تنقید واحتساب کے باوجود وہ اپنے انداز کی اچھی شاعری کرتے رہے اور بعد میں

صفِ اوّل کے شعرا میں شمار ہونے لگے۔ فراقؔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بلند آہنگی سے بچاتے رہے اور سنسکرت رسوں سے مستفید اردو شعروں سے نئے ادبی افق کو روشن کرتے رہے۔ ۴۳-۴۲ء تک نئے شاعروں کے گروہ میں جو ہونہار شاعر تھے اور جن سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اگرچہ انہوں نے تمام توقعات پوری نہیں کیں، مگر اچھے شاعروں میں شمار ہوتے رہے۔ ان میں سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی، اختر انصاری اور مسعود اختر جمال وغیرہ تھے۔ کچھ ایسے بھی شعرا تھے جنہوں نے بعد کے زمانے میں خاصا نام کمایا اور مشہور ہوئے۔ ان میں کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی قابل ذکر ہیں، مگر کچھ ایسے بھی تھے جو ابتدا میں بہت چمکے اور اپنی نظموں کی بلند آہنگی کے سبب اس وقت کے شعری انتخابات میں جگہ پاتے رہے، مگر جن کی اہمیت آزادی سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ مثلاً رضی عظیم آبادی، شہاب ملیح آبادی، شمیم کرہانی اور وقار ابنالوی وغیرہ۔ یہ وہ نوجوان شعرا تھے جو انقلاب اور آزادی کے جذبوں سے سرشار اور اسی سرشاری کا اپنی نظموں میں اظہا بھی کرتے تھے۔ رضی کی ''نوجوان کی دنیا'' شمیم کرہانی کی ''قومی سپاہی کا گیت'' اور جوان جذبے'' شہاب ملیح آبادی کی ''ہٹو آتا ہو مردِ انقلابی'' بڑی مشہور نظمیں تھیں۔ اب ان تمام شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی شاعری میں ایک نیا پن تھا یا جنہوں نے اردو شاعری کو قابل قدر شعری دولت عطا کی، خود بھی مشہور ہوئے اور ترقی پسندی کے نام کو بھی چمکایا۔ ان سب سے زیادہ دراز قد فراق اور فیض ہیں۔

فراقؔ گورکھپوری اگرچہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، مگر ان کی شعری دنیا نا کے اپنے انداز و طرز فکر سے عبارت ہے۔ فراقؔ کی آواز اور لب ولہجہ ان کی اپنی آواز اور لب ولہجہ ہے۔ اس میں جدت ہے، ندرت ہے اور ایسا انوکھا پن ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں۔ وہ ایک غیر سیاسی شاعر ہیں۔ ان کی دلچسپی، فطرت عشق و محبت، جمالیات اور تمدنی مسائل سے ہے۔ انہوں نے انگریزی اور سنسکرت روایتوں کو اردو میں اس طرح آمیز کیا ہے کہ ان کا طرز منفرد اور ممتاز ہوگیا ہے۔ فراقؔ کا اسلوب اور ان کی آواز کی انفرادیت دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی عشقیہ شاعری مشہور بھی ہے، مگر ان کی نظمیں بھی کم وقیع نہیں۔ ''ترانۂ خزاں''، ''شام عیادت''، ''آدھی رات''، ''دھندلکا'' اور ''جگنو'' مشہور نظمیں ہیں۔ ان کی سیاسی اور سماجی نظموں میں ''دھرتی کی کروٹ''، ''شاہ نامہ آدم''، ''ڈالر دیس'' اور ''امریکی بنجارہ نامہ'' وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کی شاعری میں بہت سے ناتراشیدہ ہیرے بھی جگ مگ کرتے ملیں گے۔ ''گل نغمہ'' ان کا مشہور مجموعہ کلام ہے۔ اگرچہ ان کی مختلف نظموں اور غزلوں پر مشتمل ''روح کائنات''، ''شبنم ستان''، ''رمز و کنایات'' اور ''پچھلے پہر'' کے نام سے اور بھی کئی کلام کے مجموعے ہیں۔ رباعیات میں بھی انہوں نے نام کمایا۔ ''روپ''

ISSN : 2582 - 3612

رباعیات کا مجموعہ ہے۔

فیض احمد فیضؔ ترقی پسند شعرا میں ممتاز شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ ن۔م۔راشد نے اس پر دیباچہ لکھا۔ وہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنے لہجے پر خطیبانہ انداز اور بلند آہنگی کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں رومان اور حقیقت، فنی دردمندی او ر انقلاب کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ بعد میں ان کے اور مجموعے ''دست صبا''، ''زنداں نامہ''، ''دست تہہ سنگ'' اور ''ہر وادیٔ سینا'' کے نام سے چھپے۔ ان کے یہاں ایک جمالیاتی احساس اور شعری علائم کا خوبصورت استعمال بھی ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی نظمیں ''آخری خط''، ''سرود شانہ'' اور ''تہہ نجوم'' وغیرہ ایک خوابناک فضا کی حامل نظمیں ہیں۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' رقیب سے تنہائی، موضوع سخن، ہم لوگ، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے اور دست دعا، جیسی نظمیں ایک نیا آہنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں فکر کا عنصر بھی ہے ان کی شاعری کی فکری سطح بلند ہے۔ ان کی شاعری میں اردو کی شعری روایتوں کے نمایاں عناصر بھی ملتے ہیں۔ صبح آزادی، دوشق، نثار میں تیری گلیوں پہ شیشوں کا مسیحا۔ زنداں کی ایک شام، یاد، ملاقات، روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور دریچہ وہ نظمیں ہیں جو ترقی پسندی کے اعمال نامے میں سنہرے حروف میں لکھی ملیں گی۔

اسرار الحق مجاز ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ ان کا مشہور مجموعہ کلام ''آہنگ'' ہے ان کی شاعری میں انقلاب اور رومان ہم آمیز ہیں۔ ان کی غنائیت میں شادابی اور شگفتگی ہے۔ ان کی رومانی نظموں ''طفلی کے خواب''، ''نذر دل''، ''ان کا جشن سالگرہ''، ''نورا''، ''کس سے محبت ہے''، ''ایک غم گین یاد''، ''آج کی رات'' ایک نئے عشقیہ لہجے کی امین ہیں۔ مجاز کی انقلابی نظموں میں آوارہ، اندھیری رات کا مسافر، رات اور ریل، نذرِ خالدہ ایک جلاوطن کی واپسی، نوجوان خاتون سے، خواب سحر اور آہنگ نو، بہت مشہور ہوئیں۔

معین احسن جذبی نے اپنی شاعری غزل گوئی سے شروع کی۔ اس لئے بحیثیت غزل گو ان کی ترقی پسند شاعری میں نمایاں مقام حاصل رہا۔ ان کی نظمیں طوائف، موت، آزاد فطرت، ایک مفلس کی نظر میں۔ منزل تک میری شاعری اور نقاد، آل احمد سرور کے نام۔ احساس کی شدت اور انداز بیان کی انفرادیت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ان کی نظم ''محنت'' میں زندگی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''فروزاں'' مشہور ہے۔

مخدوم محی الدین نے عشقیہ اور رومانی اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ مخدوم کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی کیف اور سرشاری کا انداز ملتا ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انقلابی مجاہد ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی بیشتر نظموں کو خشکی اور کرختگی سے بچالیا۔ ممتاز حسین نے اپنے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ایک مضمون میں کہا ہے کہ تغزل کے عناصر کی وجہ سے مخدوم کی نظمیں فن کا خوبصورت نمونہ بن جاتی ہیں، جب کہ انہیں موضوعات پر سردار جعفری کی آواز خطابت کا روپ لیتی ہے۔ ان کی نظمیں ''طور''، ''سجدہ''، ''انتظار''، ''محبت کی چھاؤں''، ''نامہ حبیب''، ''وہ'' نرورس'' اور ''پشیمانی'' خوبصورت رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں مثلاً ''انقلاب'' آتش کدہ قمر اور ''سپاہی'' اور ''اسٹالن'' اور آخری نظم ''چارہ گر'' میں تو غزلیہ عناصر کی موجودگی اسے خوبصورت فن پارہ بنا دیتی ہے بقول عزیز احمد :

''خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں۔''

ساحرلدھیانوی اپنی کچھ بہت ہی مشہور نظموں اور قلمی گیتوں کے سبب بہت زیادہ مقبول اور مشہور شاعر رہے ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں جذباتیت نمایاں ہے مجموعی طور پر ان کے یہاں بھی غزلیہ عناصر کی آمیزش نے ان کی نظموں کو خوبصورت سا دیا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کی وضاحت، بے ساختگی اور لفظوں کی مٹھاس ملتی ہے۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول نظم ''تاج محل'' ہے۔ انکی دوسری نظمیں مثلاً ''گریز''، ''چکلے''، ''لمحہ غنیمت''، ''بنگال''، ''فنکار، ''کل اور آج'' اسی دوراہے پر''، ''ایک تصویر رنگ''، ''ایک شام''، ''خودکشی سے پہلے''، ''نور جہاں کے مزار پر''، ''جاگیر''، ''مادام''، ''مفاہمت''، ''نیا سفر'' ہے۔ ''پرانے چراغ گل کردو''، ''شکست زنداں'' بھی کامیاب نظمیں ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''تلخیاں'' بہت بکا اور بہت پڑھا گیا۔ ان کی ایک طویل نظم امن کے موضوع پر ''پرچھائیاں'' کے نام سے مشہور ہے۔

ان شعرا کے علاوہ بھی ترقی پسند شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں سے کچھ کے کلام کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں اور بیشتر اپنی نظموں اور غزلوں کے سبب اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں عزیز حامد مدنی۔ وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں، نیاز حیدر، فارغ بخاری، عارف عبدالمتین، کاطر غزنوی، احمد ریاض، ظہور نظر، احمد راہی، مخمور جالندھری اور سلیمان ادیب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ترقی پسندی سے یوں تو جگراور جمیل مظہری جیسے شعرا بھی کسی حدتک متاثر ہوئے، مگر آنند نرائن ملا۔ ساغر نظامی، روش صدیقی گوپال مثل۔ عرش ملسیانی ،جگن ناتھ آزاد، حفیظ ہوشیار پوری، میراجی، مختار صدیقی اور مجید امجد وغیرہ شعرا نے بھی اثر لیا تھا اور بہت سے کچھ دنوں کے لئے سہی ترقی پسند بھی رہے اور ان شعرا کے علاوہ بھی کچھ نوجوان شعرا ہیں۔ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو آزادی کے بعد ممتاز ہوئے۔ اس لئے ان میں سے کم ہی انتہا پسند اشتراکی بن سکے۔ کچھ نے ضرور پوری تندہی سے ترقی پسندی کا نعرہ لگایا اور کچھ وہ ہیں جنہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ دوسری طرف مڑ گئے۔ یعنی جدیدیت کو فروغ دینے میں لگ گئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا، تیغ الہ آبادی، نریش کمار شاد، اشعر ملیح آبادی، راہی معصوم رضا، باقر مہدی، حسن نعیم، بلراج کومل، شہاب جعفری، مظہر امام، منظر شہاب، قاضی سلیم، وحید اختر عمیق حنفی، شاذ

تمکنت، عزیز قیسی کمال احمد صدیقی منظر سلیم، فعت سروش، حمایت علی شاعر، زبیر رضوی، حسن کمال اور انور معظم وغیرہ ایسے ہی شعرا ہیں۔ ان شاعروں نے اپنی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعوں کے ذریعہ اردو شعر کے دامن کو وسعت بھی بخشی اور وقار بھی۔ ترقی پسندی نے اگر دوسری اصناف میں کچھ بھی اضافہ نہ کیا ہوتا تو بھی محض شعری افسانوں ہی کا وزن تاریخ ادب کا ایک لازمی حصہ ہوتا۔

ترقی پسند تحریک کے اثرات اتنے ہمہ جہت تھے کہ انہوں نے نہ صرف اردو شعر کی دولت میں اضافہ کیا بلکہ اس سے زیادہ نثر کو افسانہ، ناول، ڈراما، طنز و مزاح، ڈائری، رپورتاژ اور خطوط کی شکل میں فروغ دیا۔ ساتھ ہی ترجموں کے ذریعہ کئی قابل قدر غیر ملکی ادب پارے اردو میں منتقل ہوئے۔ تنقید میں ایک مستقل اندازِ نظر مارکسی تنقید کے نام سے پروان چڑھا۔ جس کے زیر اثر قابل قدر تصانیف اردو کو ملیں۔ یہ سارے کام ترقی پسند ادبی تحریک کے ہی ممنونِ احسان ہیں۔ عصمت، کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی کا نام اہم ہے۔

Md. Wasimuddin
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. N. Mandal University
Madhepura

نزہت پروین

بہار بہ شمول جھارکھنڈ کے مشہور غیر مسلم شعراء کا اجمالی جائزہ

شاد عظیم آبادی نے شہرت، مقبولیت کے اسباب وعلل کے ضمن میں کیا خوب شعر کہا تھا۔

جو سچ پوچھو تو شاد اپنے کئے کچھ بھی نہیں ہوتا
خدا کی دین ہے انسان کا مشہور ہو جانا

اردو شاعری کا مطالعہ جنہوں نے کیا ہے انہیں معلوم ہے کہ انسان کے اندر شعر کہنے کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔ اس فطری صلاحیت کو فروغ دینے کے لئے ماحول سازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے تمام ذرائع ابلاغ بھی خدا ہی فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ شعر کے حوالے سے میں اپنی بات رکھنے سے پہلے عرض کرنا چاہوں گی کہ قدرت کی فیاضیوں کا بروقت استعمال کرنا اور فنی کمالات کا مظاہرہ کرنا بھی مثبت زاویۂ فکر اور راہ راست پر چلنے کے بعد سودمند ثابت ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، یہاں حقوق وفرائض کی تحدید کرنے سے پہلے سمجھنا ضروری ہے۔ جہاں حقوق کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں فرائض منصبی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے آزادی کی لڑائی میں بھی اہم رول نبھایا ہے۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اسی زبان نے دیا ہے۔ اس نعرے کو پرچم آزادی پھہرانے والوں نے تہہ دل سے قبول کیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی شراکت تھی۔ اردو زبان اپنی دلکشی، مٹھاس کی وجہ سے شروع سے ہی خاص وعام میں مقبول رہی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس زبان کی مخالفت کرنے والے بھی اردو زبان میں ہی اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے رہے ہیں۔ لیکن اردو زبان نے انہیں بھی سینے سے لگایا ہے۔ بہار بہ شمول جھارکھنڈ میں کئی غیر مسلم شعرا ایسے ہیں جن کی شہرت بین الاقوامی ہوگئی ہے۔ بہار کے شنکر کیموری اور جھارکھنڈ کے جوگا سنگھ انور کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

بہار میں ایک طرف جہاں مشاہیر غیر مسلم شعراء کی کثیر تعداد بستی ہے وہیں جھارکھنڈ میں بھی مشہور غیر مسلم شعراء کا شعری سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ سب سے پہلے میں بہار کے مشاہیر کے اشعار ان کے نام کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

سالک رام گوسائیں: سالک حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ مغربی پنجاب میں 27 دسمبر 1918 کو شلیاداس گوسائیں کے گھر پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ جھریا چلے آئے۔ سندری کھاد کارخانہ میں ملازمت کرلی۔ اس وقت یہ ریاست بہار کا ہی ایک حصہ تھا۔ جناب شجر فتح پوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

سالک کی بیشتر تخلیقات ملک کے مقتدر ادبی جرائد اور رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔ سالک کی ایک نظم نشان جمہوریت بہت مقبول ہوئی۔

یہ جھنڈا ترنگا ہمارانشاں ہے　　یہ بھارت کاپرچم رفیع جہاں ہے
یہ امن اور جمہوریت کا علَم ہے　　ہمارا ہے یہ بھی خدا کا کرم ہے
دل و جاں سے عزت کا حقدار ہے یہ　　کھڑا ہے جو جم کر وہ مردِ جواں ہے
را اس کے نیچے تو آکر کے بیٹھو　　دلوں سے کدورت ہٹاکر تو دیکھو
نگہ میں اسے تم بٹھاکر کے دیکھو　　اسے آسماں تک اٹھاکر کے دیکھو
زمیں سے فلک تک اسی کا مکاں ہے　　ہمالہ ہے یہ بھی تو ہندوستان ہے

جگدیش پرساد سرور: یہ قتیل داناپوری کے لائق شاگرد تھے۔ ان کے والد کا نام سرور منشی کیلاش پتی تھا۔ انہوں نے باضابطہ طور پر 1950 سے شاعری شروع کی۔ ان کے اشعار میں تصوف کا رنگ بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی پیدائش 1935 میں ہوئی اور شادی گیا کے ایک تاجر خاندان میں ہوئی۔

اب میں بہار کے چند ایسے غیر مسلم شعرا کا ذکر کررہی ہوں جو اب جھارکھنڈ میں مقیم ہیں لیکن چونکہ غیر منقسم بہار کے غیر مسلم شعراء کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اس لئے اس نئی تشکیل شدہ ریاست میں مقیم شعرا کا بھی ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ میری معلومات کے مطابق جھارکھنڈ کے درج ذیل شعراء کی شہرت ملکی اور غیر ملکی سطح پر ہے اس لئے سب سے پہلے ان کے ناموں کا اندراج کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ ان شعراء کی فہرست درج ذیل ہے۔

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، چانن سنگھ ناشاد، جوگا سنگھ انور، آزاد گرداس پوری، حیرت فرخ آبادی، جوگندر سنگھ دیپ، دل باغ رائے بھاٹیا دل، سورج سنگھ کرن، شیدا چینی، کامتا پرشاد ہوش، کملیش پرشاد کمل، نیر جالندھری، ہربنس سنگھ اختر، ہری کشور نظر، ہربھجن سنگھ رہبر، ادئے پرتاپ حیات، امیش، نذیر، دلیپ تانبے اشک، دیوندر گوتم، رام جی، گیتا مدل یار نور، لفظ جمشید پوری، پچھمی ویمل، لکھن وکرانت، مدن ساگر، نمائے چند نیمل، ہری کمار صبا، ملک گیر حیثیت سے اردو زبان کو سنوارنے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، برج نارائن چکبست، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، آنند نارائن

ملا، برج موہن دتا، تریا کیفی ،تلوک چندمحروم ،پروفرسر جگن ناتھ آزاد، اپیندر ناتھ اشک، پنڈت آنندموہن، گلزار زوتشی دہلوی، نندکشور وکرم، پروفیسر گوپی چندنارنگ، کالی داس گپتا رضا، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی ،کنور مہندرسنگھ بیدی سحر، کرشن بہار نور ،کرشن موہن، راجندموج، مہیش امبالوی کی اردو خدمات جس طرح روز روشن کی طرح عیاں ہے اسی طرح بہار کے غیر مسلم شعرا بشمول جھارکھنڈ کی شعری و ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

جہاں تک بہار کے غیر مسلم شعرا کی عظیم آبادا سکول سے وابستگی کی بات ہے ازمنہ قدیم سے ہی ہندو، عیسائی کرشچن ، پنجابی شعراء عظیم آباد کوادبی اسکول کی حیثیت سے تسلیم کرتے رہے ہیں۔

چونکہ بہار کے مسلم اور غیر مسلم شعراء مشترکہ کلچر کی نمائندگی کرتے رہے ہیں اس لئے شعروادب میں بھی استادی شاگردی کے رشتے کو مقدم سمجھتے ہوئے زانوئے ادب تہہ کرنے میں خوشی محسوس کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک ادبی اسکول کی بات ہے تو پورے بہار اور اب جھارکھنڈ، اڑیسہ، بنگال میں مشترکہ طور پر عظیم آباد کو اپنا اسکول قرار دیتے ہیں۔ ان کا عظیم آباد سے بہت پرانا لگاؤ رہا ہے۔ ان کی ذہنی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ آج بھی یہ عظیم آباد کی عظمت کو تسلیم کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خلش ایک ایسے غیر مسلم ہیں جن کا نام جگیشر پرشاد تھا۔ ابتدا میں یہ خواجہ عشرت لکھنوی سے اپنے کلام پہ اصلاح لیتے تھے ۔بعد میں سریر کابری اور بسمل سنسہاروی سے اصلاح لی۔ عظیم آباد کے بعد شہر گیا کی ادبی حیثیت کافی بلند تھی ۔شادں بھی ایسے ہی ایک غیر مسلم شاعر کا نام ہے۔ عظیم آباد میں قیام کرتے تھے۔ شائق جیسے مشہور ہندو شاعر عظیم آباد اسکول سے تربیت یافتہ تھے۔ شاد کے بعد بہت سے ہندو شعرا شاد کے فارغ البال شاگردوں سے کلام پر اصلاحیں لیتے رہے ان میں نمایاں نام مسلم عظیم آبادی کا بھی ہے۔ مسلم عظیم آبادی شاد اسکول کے ایک مستند شاعر تھے۔

میں نے بہار کے روایتی غیر مسلم شعراء کی تفصیلات بہت پہلے ہی پیش کردی ہے۔ روایتی شعراء سے مراد ایسے شعراء سے ہے جو شعراء دہلی اسکول کی داخلیت پسندی لکھنؤ اسکول کی رعنائی خیال اور نازکی عظیم آباد اسکول کی مذکورہ دونوں اسکول کی خوبیاں متصل کرتے ہوئے مضمون آفرینی پیش کرنا اس اسکول کا اختصاص قرار دیا تھا۔ اس اسکول کے نمائندہ شعراء کی فہرست سازی کرنے میں کئی لائبریریوں کی خاک چھانی تب یہ مواد فراہم ہوسکا ہے۔ ایسے شعراء میں الفت لالہ اجاگر چاند الفت آنندرام الفت منگل سین کا نام روایتی شعراء کی حیثیت سے ذہن میں آتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ روایتی عہد کے شعراء کے یہاں تخلص میں یکسانیت قائم کرنے لئے ہوڑ مچی تھی۔ روایتی شعرا کے بعد بہار کے شعرائے متقدمین میں چند اہم شعراء کی تفصیل پیش کررہی ہوں جو یوں

ISSN : 2582 - 3612

ہے۔ الفت لالہ مہابلی کے فرزند اجاگر چاند الفت کی عظیم آباد میں سکونت تھی۔ عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

الفت لالہ اجاگر متوطن عظیم آباد قوم کائستھ ماتھر پہلے غربت تخلص کرتے تھے۔ دام الفت میں گرفتار ہوکر تخلص اختیار کیا۔ میر محمد علیم تحقیق سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ نہایت قناعت پسند، خوش دل اور قلیل معاش میں بسر اوقات کرتے تھے۔ انھیں فارسی نظم ونثر دونوں پر دسترس حاصل تھا۔ یہ فارسی دیوان کے مرتب تھے۔

راز عظیم آبادی نے الفت کا ایک فارسی شعر نقل کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے فارسی زبان سے بھی شغف تھا۔ پروفیسر حسن عسکری ،لالہ الفت کے مجموعۂ مکتوبات انشائے غریب (فارسی) پر مفصل مضمون معاصر، پٹنہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا اس میں ایک اردو غزل کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ غزل یوں ہے ؎

خلوتِ نشین غم کوں تماشہ سین کام کیا   مخمور جام عشق کو صہبا سے کام کیا
دیوانۂ محبت بے اختیار کون   تکلیفِ حال صحبتِ داناسیں کام کیا
منت مئے الست کو ہے وہ تشنۂ دگر   جامِ شراب کہنہ و میناسیں کام کیا
پرودہ آفتاب محبت کوں روز حشر   باغِ نعیم و سایۂ طوبیٰ سیں کام کیا
جس کو ہے داغ مینۂ و آتش تمام دل   سیر گل و تفرج و لالہ سیں کام کیا
یارب غریب ملک معانی کو رہنما   شکل مہیب و صورت زیباسیں کام کیا

بیدار منشی بساون لال۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ایک مدت تک پٹنہ میں مقیم تھے۔ اور یہیں وفات پائی۔ ان کا نمونہ کلام یہ ہے ؎

مرے لخت جگر یوں آنسوؤں کے ساتھ جاتے ہیں   کہ یوں پھولوں کی پنکھڑی لے کے پانی میں بہاتے ہیں
ہے ترے سوا کون مرا پوچھنے والا   ہاں تجھ کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ

تذکرہ سورش اور تذکرہ عشق میں ان کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ فارسی اور ریختہ میں شعر کہتے تھے۔

تحقیق دیوان جیون رام۔ تحقیق لالہ کرپارام کے صاحبزادے موضع شیودھا ضلع مظفر پور کے باشندہ تھے۔ یہ قوم کے کائستھ تھے اور ان کا خاندان معزز ومحترم تھا ۔تحقیق کو عربی وفارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مرزا محمد علی فدوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شاداں فاروقی نے فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ ان کا اردو کلام فراہم نہیں ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ذوق بخشی آسارام۔ذوق رائے منسا رام کے بھائی تھے جومحلّہ بھگوان داس دربھنگہ میں رہتے تھے۔اورراجارام نارائن موزوں کے صوبیداری کے زمانے میں ترہت کےفوجدار تھے۔ذوق پرگنہ چاونڈ ضلع دربھنگہ کے چودھری تھے۔کچھ دنوں عظیم آبادمیں بھی قیام کیا تھالیکن ملازمت کی وجہ سے زیادہ ترکلکتہ میں رہتے تھے۔منشی آسارام ذوق مرزامحمدعلی فدوی کے شاگرد تھے۔ایک شعران کی صلاحیت کے اعتراف میں یوں پیش کیا گیاہے۔

کیوں نہ ہوشعر کا رتبہ مرے اے ذوق بلند   فدوی ہوکر رہے فدوی سے استاد کے ساتھ

ان کے کلام کانمونہ یوں ہے۔

وہ نظرمجھ کو جب نہیں آتا   کچھ نظر مجھ کو تب نہیں آتا
دل چاہتاہے تیرے ہواخواہ کار سے   شعلہ کی طرح رات جوکچھ اس طرح تھا
ذوق کے مرنے کاافسوس نہیں کچھ اس کو   غم کہاں شمع کے دل میں کسی پروانے کا
درد دل کہنے نہ پائے آج ہی   بیٹھے ہی یار تو اکتا گیا
باغ دنیامیں اب مجھے یارو   نہ غرض گل سے ہے نہ خارسے کام

رنگین منشی بلاس رام۔رنگین منشی بلاس رام راجہ امان رائے کےفرزند تھےاورعظیم آبادمیں سکونت رکھتے تھے۔یہ قوم کے کائستھ سروی واستو تھے۔۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔عزیزالدین بلخی رازعظیم آبادی نے ان کے فارسی کے دواشعارنقل کیئے ہیں۔تذکرہ عشق کےحوالے سے فصیح الدین بلخی نےاردوکاایک شعریوں درج کیاہے۔

اس مصیبت میں جوتو گھر سے نکالے ہے مجھے   یہ توبتلامیں بھلاجاؤں کدھر آخرِ شب

شوق شیوگوپال:شوق شیوگوپال عرف کاکاجی نام،تخلص شوق عظیم آبادمیں قیام تھا۔والدکانام مہاجن سوداگرمل تھا۔نمونہ کلام۔

دامن کوترے خوں نہ رہے بن بھرے ہوئے   چھوٹے نہ اپنا عشق تو قاتل مرے ہوئے

فراقی عظیم آبادی:کنورپریم کشور فارسی نثرمیں وقائع عالم شاہی کےمصنف ہیں۔لکھنؤ،بنارس اورکلکتہ کاسفرکیاتھا۔آرام کے شاگردرشید تھے۔اردواورفارسی میں شاعری کرتے تھے۔یادگارشعراکے مطابق اردواورفارسی میں نظمیں اورکبت اوردوہے بھی کہتے تھے۔نساخ نے سخن شعرا میں اردوشعردرج کیاہے۔اورلکھاہے کہ''نبیرہ راجاجگل کشوربادفروش ترک علائق کرکےسیاحت کرتے تھے۔''

فرحت لالہ رام چند:پٹنہ کےمحلّہ عالم گنج میں رہتے تھے۔فارسی کے بڑے پرگوشاعرتھے۔فارسی

میں دیوان کے علاوہ دودفتر فارسی مثنوی کے لکھے تھے۔ایک کانام گنج شائیگاں اوردوسرے دفترکانام گنج باد آورد ہے۔حمدونعت،صنعت وذوبحرین میں لکھی ہے۔

یہ مثنوی انھوں نے ۱۱۸۸ھ میں تصنیف کی تھی۔مثنوی کے متفرق اشعار فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں درج کیئے ہیں۔شاعرکی قادرالکلامی کااندازہ اس بات سے لگایاجاسکتاہے کہ اس نے چارماہ میں مثنوی مکمل کی تھی۔اس میں ۹۱۳۲/اشعار ہیں۔اسے شعرمیں یوں پیش کیا گیاہے۔

نیزشعرہردودفتردرشمار   یک صداہست وسی ودوبانۂ ہزار

گریاں راج بھوانی سنگھ:راجابھوانی سنگھ بہادرعرف راجاکنور والدکانام راجاشتاب رائے شاگردفدوی نمونہ کلام یوں ہے۔

دل ہی نہیں ملے ہے ملیں کیا نشان داغ
مدت سے ڈھونڈتا ہوں کروں کیا بیان باغ

مسکین لالہ بخت مل:یہ عظیم آبادمیں سکونت پزیرتھے۔ایک تحقیق کےمطابق ۱۱۹۰ھ تک حیات تھے۔ان کی شاعری کانمونہ یوں ہے۔

روئے زمین جتنے بھی ہیں یادحق ہیں پھرتے
وہ آدمی نہیں ہے ماٹی کی مورتی ہے

ان شعراکے بعددورجدیدکےغیرمسلم شعراءکی فہرست آئندہ کسی مضمون میں پیش کی جائےگی۔

Nuzhat Parween
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya

محمد عارف حسین

راغب کا غیر منقوط نعتیہ مجموعہ ''مدح رسول'': ایک مطالعہ

راغب مرادآبادی کا اصل نام اصغر حسین اور تخلص راغب ہے۔ ان کی پیدائش ۲۷ مارچ ۱۹۱۸ء کو دہلی میں ہوئی۔ آبائی وطن مرادآباد تھا۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے السنہ شرقیہ کے کئی امتحان پاس کیے۔ طبیہ کالج دہلی سے طب کی سند بھی حاصل کی، مگر سرکاری ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے اور ملازمت لیبر ڈپارٹمنٹ میں کی۔ ۱۹۸۰ء میں اسی ڈپارٹمنٹ میں پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ ان کی شعری تربیت میں مولانا ظفر خاں کا ہاتھ ہے۔ انھوں نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ صنف سخن ہے۔ تاریخ گوئی میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی تصانیف کے چند نام یہ ہیں۔

(۱) بدرالدجیٰ (نعتیں) (۲) آزادی (رباعیات) (۳) مکالمات جوش و راغب (۴) حضور خاتم الانبیا (سلام، نعتیہ رباعیات) (۵) مدحت خیر البشر (نعتیہ اشعار) (۶) ضیائے سخن (۷) محنت کی ریت (منظومات) (۸) تحریک (مضامین)، (۹) ترغیب (مضامین) (۱۰) نذر شہدائے کربلا (سلام و رباعیات) (۱۱) ہمارا کشمیر (منظومات) (۱۲) عزم و ایثار (منظومات) (۱۳) تاریاں دی لو (پنجابی شاعری) (۱۴) جادۂ رحمت (سفرنامہ) (۱۵) مدح رسول (غیر منقوط نعتیہ کلام) (۱۶) ساغر صد رنگ (۱۰۰ منتخب اشعار) (۱۷) امن و امان (۱۸) قومی یک جہتی (۱۹) دہشت گردی (انتخاب) (۲۰) رگ گفتار (اردو، فارسی غزلیات و رباعیات)۔

حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''تمغہ حسن کارکردگی'' سے بھی نوازا ہے۔ جناب راغب مرادآبادی ۱۸ جنوری ۲۰۱۱ء کو دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔

راغب مرادآبادی کا شمار ان ممتاز صاحب فکر اساتذہ میں ہوتا ہے جو کلاسیکی روایات کی باریکیوں کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں۔ انھیں شاعری کی مختلف اصناف پر عبور حاصل ہے لیکن تاریخ گوئی اور فی البدیہہ میں بے مثل ہیں زبان و بیان اور فنی رموز کے حوالے سے ان کا کلام سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے

لیکن ان کی پہچان ان کی رباعیات ہیں۔ ان کے اب تک تقریباً ۴۰ مجموعات کلام شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں غزلیں، نظمیں، نعت اور پنجابی شاعری شامل ہیں۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کے دوران یہ نیت کی کہ ایک ایسا مجموعہ نعت مرتب کیا جائے جس کی ہر نعت کی ردیف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو قرآن حکیم میں سورۃ محمد موجود ہے۔ اور یہ اسم پاک کلمہ کا حصہ ہے۔ جیسے ہی وطن پہنچے اور ارادہ کو عملی شکل دی اور ۶ ۷ نعتوں پر مشتمل مجموعہ مرتب کیا۔

''مدح رسول'' راغب مرادآبادی صاحب کا غیر منقوط، نعتیہ مجموعہ کلام ہے اس سے قبل منقوطہ نعتیہ کلام ''مدحت خیر البشر'' کے نام سے چھپ کر اہل علم و ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ 'راغب مرادآبادی نے ''مدح رسول'' کے نام سے کتاب ۱۹۷۹ء میں تصنیف کر لی تھی۔ مگر کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ کتاب ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری نو صفحات، فرہنگ کے لئے مختص ہیں۔ اردو غیر منقوط نعتیہ مجموعوں میں ''مدح رسول'' کو اولیت حاصل ہے۔

نمونہ کلام ؎

عدل، صمد، ودود، مودود اللہ روح سمک ملھم داود اللہ
اک سر صدا اسرار اساس عالم عالم عالم کا اصل معہود اللہ
محمد کو، مراد و مدعا لکھ دوعالم کا سہارا، آسرا لکھ
محمد، راکع و حماد مولا اٹھا کلک اور روداد حرا لکھ

راغب مرادآبادی کی زود گوئی کے چرچے زبان زد عام ہیں۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں شاعری کی ہے۔ راغب صاحب کی دوسری کتاب ''مدح رسول'' ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد قلم یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ یہ کتاب نہ صرف علم و فن سے مزین ہے بلکہ راغب صاحب کا عشق رسول واضح طور پر کتاب کے ہر ہر صفحے پر جگمگا رہا ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ:

> ''مدح رسول کی نعتوں اور رباعیوں میں بہت کم ایسے مقامات ہیں۔ جہاں صنعت غیر منقوط میں اظہار، جذبہ اور اردو کے مزاج پر غالب آئی ہو وہاں بیشتر مقامات پر یہ مشکل صنعت حجاب درمیاں نہیں بنی ہے بلکہ وسیلۂ انعکاس جذبہ و خیال کے طور پر سامنے آتی ہے''۔
>
> (مدح رسول، راغب مرادآبادی، مطبع ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴)

ڈاکٹر شان الحق حقی تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''جناب راغب مرادآبادی ہمارے عہد کی ان چند باکمال ہستیوں

میں ہیں جن کے سامنے میرا سر نیاز جذبہ عقیدت اور وفور تحسین سے جھک جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو استاد نہیں کہلوایا، مگر استاد کا لقب انہیں زیب دیتا ہے۔

(مدح رسول، راغب مرادآبادی، مطبع ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۰)

مزید فرماتے ہیں کہ:

راغب صاحب کی نعتوں میں کہیں بھی کوئی بات ثقاہت یا معقولیت سے ہٹی ہوئی نہیں ملے گی۔ اظہار محبت وارادت ہے، جیسا کہ چاہیے مگر پوری احتیاطوں کے ساتھ جو ان کے خلوص کلام کی شاہد ہیں۔ یہ مجموعہ اردو ادب کے جواہر خانے میں ایک بہا اضافہ ہے اور یقین ہے کہ فارسی میں فیضی کی ''سواطع الالہام'' کی طرح راغب صاحب کا یہ کارنامہ بھی اردو میں منفرد رہے گا۔ جزاہ اللہ خیرالجزا۔

(مدح رسول، راغب مرادآبادی، مطبع ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۶)

ہمیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ راغب مرادآبادی نہ صرف یہ کہ وہ ایک بڑے شاعر تھے بلکہ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے چند نعتیہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

دوعالم کا حاصل محمد   محامد کا حامل محمد

علمدار اسم احد کا   وہ علام کامل محمد

سرور دوسرا درود و سلام   ماہ دار حرا درود و سلام

محرم سر لا و الا اللہ   حرم مدعا درود و سلام

راغب صاحب کے اس مجموعے میں صنعت غیر منقوطہ میں چالس نعتیں اور تیئس رباعیاں ہیں۔ ان کے پہلے نعتیہ مجموعے ''مدحت خیرالبشر'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶۳ سالہ حیات مبارکہ کی نسبت سے ۶۳ نعتیں تھیں۔ دوسرے مجموعے میں بات ۶۳ کے التزام سے آگے بڑھ گئی ہے۔ چالیس نعتیں حیات قبل بعثت کا احاطہ کر رہی ہیں اور ۲۳ رباعیوں میں زمان نبوت کا نقش ہے۔

بعض اشعار روانی کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ یہ اشعار غیر منقوطہ ہیں پڑھنے یا سننے والے کو پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً

ہو گوہر اکرام عطا احمد مرسل   ہر لمحہ کرم اور سوا احمد مرسل

ISSN : 2582 - 3612

حاصل مدام دل کو گل مدعا ہوا   دائم در رسول ملا اور کھلا ہوا

محمد کا کرم درکار ہوگا   مرا دل محرم اسرار ہوگا

محمد کو مراد و مدعا لکھ   دوعالم کا سہارا آسرا لکھ

ہوگا معدوم ہالہ اوہام   حوصلہ حوصلہ دل محصور

مرا دور دور مسائل   کرو حل مسائل محمد

دوعالم کا دل اور دل آرا محمد   ہمارا محمد ہمارا محمد

اسم رسول دوسرا صل علیٰ محمد   ورد مرا سدا رہا صل علیٰ محمد

مسلسل اس کا کرم لا الٰہ الااللہ   ہو ورد دم ہمہ دم لا الٰہ الا اللہ

اگر ہو درک کلام رسول کا راغب   گل سواد ارم لاالٰہ الا اللہ

کتاب میں اظہر عباس ہاشمی، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، شان الحق حقی اور سید فراست رضوی کی تحریریں شامل ہیں جس میں راغب مرادآبادی کی قابلیت اور ان کی شاعری کے ہر فن میں قدرت کا برملا اعتراف ہے۔ کتاب کے آغاز میں ''اولاد والو'' کے عنوان سے راغب صاحب کی مختصر نثری تحریر صنعت غیر منقوط میں ہے۔ اور اسی صنعت میں ''الحمدللہ'' کے عنوان سے انہوں نے اللہ رب العزت کی حمد وثنا، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف کے ساتھ اپنے مخلصین، محبین کا شکریہ ادا کیا ہے۔ کتاب میں عناوین کی فہرست کے لئے ''فہرست'' کا متبادل لفظ ''سلک درر'' کا استعمال ہے۔ اور اس کے تحت سارے عناوین کی سرخیاں ہیں۔

مصنف ''مدح رسول'' نے صرف ۱۷ غیر منقوطہ حروف تہجی کے محدود و مختصر دائرے میں رہ کر بہ توفیق ایزدی، مداحی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ادا کیا ہے اور وہ بھی نظم میں جہاں فنی، لسانی اور عروضی پابندیوں کو مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

راغب مرادآبادی کا مجموعہ نعت ''مدح رسول'' (غیر منقوط) اہل علم واہل دل کے لے ایک خزینہ ہے اور حضرت راغب مرادآبادی کے لئے ذریعہ نجات ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ بھی ہے۔

Md. Aarif Hussain
Research Scholar
Supervisor: Dr. Shahab Zafar Azmi
University Deptt. of Urdu
Patna University, Patna

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ترنم بانو

نثر و نظم میں شاد عظیم آبادی اسکول کو مسلم عظیم آبادی کی دین

اردو شعروادب میں تخلیقی کاوشات دو صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ایک نثر اور دوسری نظم۔اگر نثر معنی خیز حروف کے منضبط جملوں کی نشست و برخواست کا نام ہے تو اس صورت میں اس کی پیچیدگی کے بڑھنے کا خدشہ ہے۔کئی حروف مل کر جملے اور کئی جملے مل کر نتیجہ خیز انجام تک پہنچتے ہوئے ایک تخلیقی عمل سے بہرہ ور ہونے کا نام نثر نگاری ہے۔ اسے زیادہ سہل انداز میں سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا موازنہ نظم (منظوم) سے کیا جائے۔ہر شعر پہلے نثر ہے اور بعد میں منظوم۔شاعری میں بالخصوص غزل نگاری میں شاعر کو اپنے شعر کو پہلے نثر میں ڈھالنا پڑتا ہے اور پھر موزونیٔ طبع سے فعل فاعل فعلن مفاعلن کے اوزان میں تشکیل کے مراحل سے گذر کر معنی آفرینی حاصل کی جاتی ہے۔یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا نثر نظم پر فوقیت یا اولیت رکھتی ہے؟اس کا جواب ہاں اور نہیں دونوں صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ہاں اس لئے کہ شعر سے پہلے ہر مصرعے کی نثر تخلیقی عمل سے گزرتی ہے۔لفظوں کی ایک بامعنی ترتیب نثر میں تو ممکن ہے لیکن شعر میں بحر و اوزان کی مجبوری ہونے سے کوئی بھی لفظ آگے یا پیچھے ترتیب پاکر تخلیقی صورت گری کے زمرے میں آتی ہے۔

میں اپنے تحقیقی کی شروعات کر رہی ہوں اس کا تعلق فکشن اور ڈرامہ دونوں سے ہے۔اس لئے لازم ہے کہ نثر پارے کے بارے میں اپنا مطمح نظر واضح کردوں۔ جہاں تک فکشن کی بات ہے یہ لفظ انگریزی ادب سے اردو میں آیا ہے۔Fiction کو اردو میں افسانہ کہا جاتا ہے۔یہاں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ فکشن کہانی سے کس حد تک مختلف ہے۔اردو میں فکشن لفظ کا استعمال مختصر کہانی کے لئے ہوتا ہے۔مختصر سے مراد افسانچہ نہیں ہے۔معاف کیجئے میں افسانچہ نگاری کو فکشن کے دائرے میں نہیں رکھتی۔فکشن میں پلاٹ، کردار اور فضا کی موجودگی ضروری ہے۔ پاکستان کے بلند مرتبت ناقد وزیر آغا نے فکشن میں مذکورہ تینوں عناصر ثلاثہ کو فکشن کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔اردو میں مشرقی ادبیات کو فروغ دینے میں پریم چند کا نام سرفہرست ہے۔ اردو میں کہانی کی معنویت اور اس کا تصور پریم چند کی دین ہے۔ چونکہ پریم چند نے اردو میں ہی کہانی لکھنے کی شروعات کی تھی اس لئے ان کے بعد کی نسلوں میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، غیاث احمد گدی نے کہانی کی معنویت کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے آئینے میں پیش کیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پریم

ISSN : 2582 - 3612

چند سے قبل بھی جو افسانے لکھے جارہے تھے اس میں کہانی پن کے عناصر موجود تھے؟ تو اس کا جواب مثبت ہی ہو سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ میرے تحقیقی مقالہ کا جو ضمنی عنوان ہے وہ فکشن سے ہی تعلق رکھتا ہے۔اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ مسلم عظیم آبادی جس عہد میں کہانیاں لکھ رہے تھے وہ تاثر انگیزی کے لحاظ سے کہانیوں کے دائرے میں آتی ہیں۔ ہر دس سال کے بعد ادب کے تخلیقی رجحان میں تغیر و تبدل کی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔لفظ فکشن سے لفظ Ficticious تصوراتی بنا ہے۔یعنی محض تصوراتی تھیم پر منحصر کرنے والی تحریر کو کہانی کہہ سکتے ہیں۔ مسلم عظیم آبادی کی بیشتر کہانیاں فکشن نہ ہوکر کہانی ہیں۔اس لئے کہ اس میں مسلم معاشرہ پوری طرح اپنے تہذیبی ،سماجی، ادبی تناظرات میں منعکس ہوا ہے۔مسلم عظیم آبادی کے افسانے میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔انھوں نے خطوط کی شکل میں بھی اخلاقیات کا درس دیا ہے۔ان دونوں صورتوں میں ان کی نثر نگاری حقیقت پسندی کی مثال ہے۔مسلم عظیم آبادی کی تحریروں میں ہمیں فکشن کی تلاش کرتے ہوئے بہت دور نہیں نکل جانا چاہیئے اس لئے کہ مسلم عظیم آبادی جس عہد کی پیداوار ہیں وہاں انتشار و افتراق کی نوعیت آزادی سے قبل کی ہنگامی صورت حال سے مختلف ہے۔

دراصل مسلم عظیم آبادی ایک ایسی ادبی شخصیت کا نام ہے جو ادب کی مختلف اصناف پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ یہ صلاحیت ان کی خداداد تھی لیکن ان کے ہنر کی ضیاء پاشی شاد عظیم آبادی جیسے شاعر نے کی اس لئے ان کے فکر و فن میں فزوں تر اضافہ ہوا ہے۔

میرے خیال سے انہوں نے شاد عظیم آبادی اسکول کو درج ذیل خصوصیات عطا کی ہیں۔

۱۔ مسلم عظیم آبادی کے سامنے کئی دہلوی، لکھنوی اسکول کے اساتذہ کا انتخاب پیش نظر تھا لیکن ان کی نگاہ دوربیں نے شاد عظیم آبادی کو ہی منتخب کیا۔

۲۔ شاد کی طرح مسلم عظیم آبادی نے ذکی الحس طبیعت پائی تھی ۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔انگریزی ادب کا براہ راست مطالعہ نہ کر اس کے ترجمے پڑھتے تھے۔مشق و مزاولت سے انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔اس کا فائدہ تخلیقات کی مختلف جہتوں، صورتوں کو واضح کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

۳۔ مسلم عظیم آبادی نے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' جیسی خود نوشت کی ترتیب و تالیف کو سلیقے سے پیش کیا۔

۴۔ مسلم عظیم آبادی کی تحریر کا عالمانہ رنگ کسی کو میسر نہ ہوسکا۔نشاطیہ شاعری ہو یا حزنیہ انہوں نے شاد کے اسلوب کے سرمایے میں گرانقدر اضافہ کیا۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

۵ شاعری کی مختلف اصناف پرقدرت حاصل ہونے کے باوصف ان کی شہرت میں کم ہی مدت میں چار چاند لگ گئے ۔میری دانست میں شادعظیم آبادی اسکول سے فارغ البال ہونے والوں میں اب تک مسلم عظیم آبادی کے قد کا شاعر پیدا نہیں ہوا۔

انہوں نے غزل،نظم ،رباعی ،قطعہ ،مرثیہ ،سہرا،قطعہ تاریخ جیسی اصناف کے معیار ووقار میں اضافہ کیا ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے جتنے بھی کلام ہیں ان میں اوزان کا جھول،زبان کی غلطی ،تشبیہہ واستعارات کا بے محل استعمال نہیں کیا ہے۔یہ تقریباً تیس برسوں تک ہزاری باغ کے کولمبس کالج میں پروفیسر رہے۔ان کے پڑھائے کئی طلبا ملک کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوکر سبکدوش ہو چکے ہیں۔

اس ضمن میں تبرکاً ان کے شعری اصناف سے کچھ تخلیقات پیش کی جاتی ہیں۔

غزل

کیا ہے یاس نے آ آکر بے قرار مجھے
جہاں امید سے دیکھا ہے ہم کنار مجھے

نہاں ہے اصل حقیقت مری خدا کا شکر
زمانہ جانتا ہے رند بادہ خوار مجھے

سپرد موج فنا کر دے جو ساحل دور
کھلا نہ ٹھوکر یں اے سیل روزگار مجھے

بہت ہے میرے لئے اک یہی کرم تیرا
تمام عمر جو رکھا امیدوار مجھے

اجل جو وادیٔ غربت سے لے چلی مجھ کو
تو بے کسی مری تکتی تھی بار بار مجھے

ابیات برائے تکیہ

۱ رگ رگ میں پھر رہے ہیں،آنکھوں میں بس رہے ہیں
ہم ان کی اک جھلک کو پھر بھی ترس رہے ہیں

۲ دن بھر ترا تصور شب بھر ہے خواب تیرا
ہے چشم شوق میں کب حائل حجاب تیرا

۳ مدت پہ دیکھی روٹھنے والے کی اک جھلک
یا میں نے آج خواب میں دیکھا ہے خواب کو

۴ نیند آ گئی تو آپ کا دیدار ہو گیا
سویا تھا جو نصیب وہ بے دار ہو گیا

ماثیر عیدالاضحیٰ

اس عید میں یوں اشک وتبسم ہیں بہم
لب ہنستے ہیں اور روتا ہے دل آنکھیں پرنم

جو دل میں بسے وہی آنکھوں سے ہے دور
بتلاؤ کوئی کیا کریں اس عید کو ہم

دعوت پہ جو آپ آئے تو احساں ہے ضرور
تھا عین کرم جو بے بلائے آئے

قطعہ

دلکش ہیں بہت آرٹ بھی سائنس کی دین بھی
افسوس پناہ آج نہیں مجھ کو کہیں بھی

اک مسلک نا رخنہ ہے جو لانگہ مسلم
اس محفل صد رنگ میں میں ہوں بھی نہیں بھی

رباعی

ایسا نہ ملا مجھ کو کوئی بھی دمساز
سنتا جو مرے دل کی میں اس کی آواز

ہو کس کی رسائی مرے دل تک مسلم
نادیدہ ہے پرواز تو ناگفتہ ہے راز

اختتام تذکرہ شاد پر

جب کرچکا میں تذکرہ شادو مدون
باقی نہیں کچھ مشغلہ جز خوردن خفتن

شعرآ کے مچل جاتے ہیں تھامے مرا دامن
سر ان کو چڑھاتا نہیں رکھتا ہوں انہیں رام

دوں ڈھیل تو بن جائیں یہیں رام سے راون

ماحصل

میری اس تلخیص میں شامل موادِ کے پیش نظر درج ذیل نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

۱ مسلم عظیم آبادی جہت ہمہ جہت اور متعدد اصناف پر قدرت کاملہ رکھنے والے تخلیق کار تھے۔

۲ ایسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

۳ یہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔

۴ ڈاکٹر محمد محسن سبکدوش پروفیسر پٹنہ کالج نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلم عظیم آبادی بہار جھارکھنڈ کے پہلے افسانہ نگار تھے۔میں بھی مطالعے کے بعد اس نقطے پر متفق ہوں۔

۵ یہ شادعظیم آبادی کے لائق شاگرد تھے۔ان کی منظوم تخلیقات 1903 سے ہی شائع ہوکر مقبول ہونے لگی تھیں۔

۶ ان کی دو کتابیں دعوت فکر اور گلہائے رنگارنگ ان کے مقام کو مستحکم کرنے کے لئے کافی ہیں۔دعوتِ فکر نشتر اور گلہائے رنگارنگ شاعری پر مشتمل کتاب ہے۔

۷ مسلم عظیم آبادی نے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' خودنوشت کی ترتیب وتدوین کی تھی۔اس کام

سے شاد بہت خوش ہوئے تھے۔اسی کی طرز پر لائق شاگرد نے بھی ''مسلم کی کہانی مسلم کی زبانی'' سوانح عمر لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔

۸۔ میری تحقیق کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ مسلم عظیم آبادی کا دائرہ کار جھارکھنڈ تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں سے بھی مسلم عظیم آبادی سے متعلق مواد حاصل کیا ہے۔

۹۔ مسلم عظیم آبادی کے خاندان کا پس منظر بیان کرنے میں علمائے صادق پور جو مجاہدین آزادی بھی تھے ان کے حوالے سے مواد فراہم کرنے میں آسانی ہوئی ہے۔اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مسلم عظیم آبادی کی ساری زندگی جدوجہد میں گذری ہے۔

۱۰۔ مسلم عظیم آباد کی پوری زندگی صبر آزما گھڑی سے گذرتی رہی۔ان کی اہلیہ کو کبھی سکھ چین نصیب نہیں ہوا۔ بڑے بیٹے کی موت سے یہ بہت دل برداشتہ ہوئے۔نومولود بیٹے کی رحلت سے یہ اور مضمحل ہو گئے لیکن صبر وقناعت کا دامن نہیں چھوڑا۔

۱۱۔ مسلم عظیم آبادی مشرقی شعریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔اس لئے انہوں نے روایتی اصناف کو بھی وقار بخشا۔

۱۲۔ انگریزی زبان اپنے خاندان کے ایک فرد سے سیکھی۔انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے فن پر دسترس رکھتے تھے۔

۱۳۔ اپنے معاشرے اور سماج کی فلاح میں اپنی تحریر سے روح پھونکنے کی کوشش کرتے رہے۔

۱۴۔ مسلم عظیم آبادی اردو زبان وادب کے صاحبِ طرز ادیب،اسکالر شاعرانہ انشا پرداز، ناقد، انشائیہ نگار، مترجم تھے۔اتنی ساری خوبیاں اگر ایک شخص میں مجتمع ہو جائیں تو مجھ جیسی اردو کی ریسرچ اسکالر اور اردو کے دوسرے بہی خواہاں کیلئے قابلِ صد افتخار شخصیت ٹھہرینگے۔

Tarannum Bano
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
Magadh University, Bodh Gaya

رضیہ عائشہ جوائز

ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' کا تجزیاتی مطالعہ

مشرف عالم ذوقی نے اردو فکشن کے ذریعہ اپنے ہم عصروں میں خود کی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ذوقی نے ناول نگاری کی ابتدا 1978ء سے کیا وہیں یہ سلسلہ موت سے قبل تک جاری و ساری رہا۔اب تک ان کے درجنوں ناول منظر عام پر آنے کے بعد قاری کے درمیان تبادلہ خیال کا موضوع رہا۔ذوقی کے فکشن کے موضوعات پر نگاہ ڈلنے سے اندازہ بہ خوبی ہو جاتا ہے کہ ان کے مشاہدے میں معاشرے کا کوئی ایسا پہلو نہ رہا ہو جس پر ان کا قلم نہ اُٹھا ہو۔ذوقی نے اپنے ناولوں کے موضوعات میں انسانی زندگی کے اُتار چڑھاؤ، خاندانی رشتے، معاشرے کے مسائل، زندگی کی مصروفیت، سائنس اور تکنیکی سے پرنے والے اثرات، مذہبی فسادات، سیاسی چال بازیاں، قدرتی قہر وغیرہ کو موضوع بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ ذوقی ان تمام پہلوؤں سے خود نبرد آزما ہیں۔

ذوقی کے ناولوں میں ایک ایسی خوبی نظر آتی ہے جو ان کے ہم عصروں میں بہت کم دکھائی پڑتا ہے وہ خوبی یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام ناولوں میں یکسانیت نظر نہیں آتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل و دماغ میں مختلف موضوعات کا ذخیرہ جمع ہے۔ذوقی کے ناولوں کے کرداروں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو ان کا کوئی بھی کردار دوسری دنیا کا نظر نہیں آتا۔ بلکہ تمام کردار قاری سے آشنا لگتا ہے۔یہ کردار ہمارے ارد گرد سے نکل کر قاری کے درمیان اپنی الگ پہچان بناتے ہوئے نظر آتا ہے۔ذوقی کی اہم خوبی ہے کہ وہ بدلتے وقت سے ساتھ ساتھ اپنے ناولوں کے کرداروں کو بھی تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے تمام ناولوں میں نئے نئے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس کے منفی اور مثبت پہلوں سے آگاہ کرانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔اس لئے ان کے ناولوں میں وہ تمام چیزیں نظر آتی ہے جس سے آج ہمارا معاشرہ گزر رہا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' 2005ء میں ''ساشا

پبلیکیشنز، دہلی'' سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا اور ابتدا دن سے یہ ناول اردو ادب کے قاری کے درمیان بحث کا موضوع بننے میں کامیاب رہا ہے۔ یہ ناول 519 صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول نگار نے اس ناول کے ذریعہ موجودہ عہد کی سیاسی، معاشرتی، مذہبی، ادبی اور فکری اور سماج میں رونما ہونے والے مسائل کے خلاف احتجاج کی داستان قلم بند کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ذوقی نے ناول کے عنوان میں اک لفظ'' سونامی'' کا استعمال کیا ہے اس سونامی کا استعارہ اس لیے لایا گیا ہے کہ موجودہ عہد میں ہماری تہذیب جو مشرقی تہذیب کی علم بردار رہی ہے لیکن اب مشرقی تہذیب پر کچھ ایسی سونامی آئی ہے کہ ہر کوئی مغربی تہذیب کا دلدادہ نظر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے مشرقی شناخت کہیں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار نے اس سونامی کا نوحہ بیان کرتے ہیں۔ ذوقی نے اس ناول میں سونامی کا سہارا لیا ہے اور اس کا مقصد صرف یہی رہا ہوگا کہ موجودہ عہد میں زندگی کے تمام شعبوں میں کسی نہ کسی شکل میں سونامی آئی ہوئی ہے۔ ذوقی نے قلم کے وہ نشتر چلائے ہیں کہ اس سے کوئی بھی شعبہ بچ نہ سکا۔ ناول میں ایک جگہ اردو زبان کی ترقی میں تنزلی کا آنا اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ''جو زبان کے فروغ کا دھندا کرتے ہیں اور انعام و اکرام حاصل کرتے ہیں۔''

ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' میں ذوقی نے موجودہ عہد میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کا کھل کر بیان کیا ہے۔ خواہ وہ معاشرتی ہو یا سیاسی، مذہبی ہو یا ادبی یا پھر وغیرہ۔ اس ناول میں کئی کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ وہیں اس ناول کا اہم کردار ''وقت'' کو مانا جاتا ہے۔ کیوں کہ وقت جو سونامی کی طرح ہماری تہذیبی و ثقافتی، اخلاقی قدروں کو اپنے طوفان میں بہا لے رہا ہے اور اپنے بہاو میں معاشرے کو ایک بدنما داغ دیتا ہے۔ جس میں انسانی قدروں کو پامال تو کرتا ہی ہے ۔ اور سماج میں مختلف طرح کی بُرائیاں اپنے قدم مضبوط کرتا ہے یوں سمجھے کہ معاشرے میں مکار، فریبی، دغاباز اور مکروہ سماج ایک نیا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ ''جس میں بسنے والے کچھ باشعور اور باضمیر لوگ اپنے انسان ہونے پر شرم محسوس کرتے ہیں۔'' ذوقی نے اس ناول میں سونامی کا سہارا لے کر معاشرے میں تبدیل ہوتے چہرے کو پیش کیا ہے۔ درج ذیلِ اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ ہیں اور آپ کو حکومت کرنا ہے۔ جو حکومت کرتے ہیں وہ رشتوں ناطوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ آپ کو حکومت کرنا ہے تو ایسے تمام

رشتوں کو ٹھوکر مارنا ہوگا کیونکہ رشتے ہمیں کمزور کر دیتے ہیں۔ رشتے ہمیں غرض کی ڈور سے باندھتے ہیں۔''

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں سونامی کی لہروں کو سماج میں رونما ہونے والی ہلچل کے طور پر دیکھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ناول جہاں ایک طرف 27/ دسمبر 2004ء کی خوفناک صورت حال اور کرب واذیت کو پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ان سونامی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہماری تہذیبی، ثقافتی اور ادبی دنیا کو تیزی سے تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہے۔ نیوٹن کے قانون کے مطابق ''ہر عمل کا اس کے متوازی اور مخالف ایک ردّعمل ہوتا ہے۔''

یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ سے ہی قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔ پہلے حصہ میں احمد علی اور ادیتی سانیال کے کردار غیر معمولی ہیں لیکن ذہن پر پروفیسر یا پرویز سے زیادہ قاری کے ذہن پر گہرا نقش قائم کرتے ہیں۔ اس حصہ میں احمد علی کی زندگی اُتار چڑھاو کا بیان ملتا ہے جس میں اس کی غریبی سے امیری کا سفر، سندیپ دا جیسے کمیونسٹ سے ملاقات، جوٹ ملس کے مینجر کو قتل کرنے کا پلان، اور آخر میں احمد علی کا توبہ کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ وہیں'' شاہ پور چھولداری میں آمد، کمیونزم سے مذہب کی طرف مراجعت، پرویز سانیال کا جنم اور پروفیسر قریشی کی عجیب داستان میں اس کی شمولیت اور درمیان میں سیما اور شیلی کے خودسپردگی سے بھرپور جذبات کی عکاسی قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی قوت رکھتا ہے۔''

ناول کا دوسرا حصہ سونامی کے المیے اور اس کی خوفناک تباہ کاریوں پر مشتمل ہیں۔ ذوقی نے اس حصہ میں سونامی کی کہانی کو اس طرح پھیلایا ہے کہ تمام واقعات صحافتی ادب کا حصہ معلوم پڑتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ناول نگار کے صحافتی اسلوب نے اسے اپنے ناول کے پلاٹ سے گرفت کمزور کرلی۔ وہیں اس حصہ میں ناول نگار نے بائبل کے طویل اقتباسات کا سہارا لیا ہے لیکن فنی اعتبار سے یہ طویل اقتباسات نے ناول کے قصوں کو کہیں کہیں نقصان پہنچایا ہے۔ سونامی کا سہارا لے کر ناول نگار نے مختلف موضوعات کا جائزہ لیا ہے جس میں ایک اہم موضوع ادب میں گندی سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''اس ناول میں ذوقی نے احتجاج بھی کیا ہے، ادبی مافیا کو بے نقاب بھی کیا ہے اور کچھ واقعات کا ذکر بھی کیا ہے جس سے مصنف کا کبھی تعلق رہ چکا ہے۔ جیسے ای ٹی۔ وی کا معاملہ ہو یا رسالہ نکالنے کا معاملہ یا خانقاہی کا ناول لکھنا وغیرہ جس کی وجہ سے ذوقی پر اعتراضات بھی اُٹھے ہیں۔ باوجود

طوالت، Documentationاوراعتراضات کے ذوقی کا یہ ناول اہم ہے۔''

مشرف عالم ذوقی کی فکشن کی کردارنگاری پر نگاہ پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام کرداروں کے ساتھ وقت گزارا ہے۔کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں پڑتا ہے کہ کردار میں کسی طرح کی کوئی کمی باقی رہ گئی ہو۔ان کے ناول کے کردار حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ذوقی اپنی کہانیوں میں زندگی کی روح ڈالنے کا ہنر جانتے ہیں اور کبھی نہ بھولنے والے کردار کی اختراع کرتے ہیں۔اس ناول میں پیش کئے گئے کرداروں میں احمد علی، سندیپ دا، پرویز سانیال سیما، ادیتی وغیرہ ہیں لیکن ناول کا اہم کردار ''وقت'' ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر ایس جو ناول کا مرکزی کردار کی حیثیت رکھتیا ہے۔

ناول میں پروفیسر ایس کا پورا نام صدرالدین ہے۔پروفیسر ایس، پرویز سانیال کو اپنا کلون بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔پروفیسر ایس نے اپنے دس سالا تجربات کو یکجا کر کے پرویز سانیال کو ہم شکل بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ملتی ہے۔ناول میں پروفیسر ایس کا کردار ایک مکار، جھوٹے اور فریبی کا ہے۔ناول نگار نے اس کردار کی شخصیت کی کچھ طرح سے عکاسی کی ہے کہ وہ سچ سے بھاگنے والا ،غروراور تکبر کی چادر میں لپٹا ہوا ظالم شخص معلوم ہوتا ہے۔وہ عورت کو صرف جنسی ضروریات پورا کرنے والی ایک شئے سمجھتا ہے۔'' وہ محبت اور محبت کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے اور محبت کو بیکار شئے مانتا ہے۔ پروفیسر ایس کا کہنا ہے کہ محبت کمزور لوگوں کا ہتھیار ہے۔صحتمند انسان محبت نہیں کرتا ہے۔محبت کمزوری کی علامت ہے جو زندہ آنکھوں سے دیکھنے کی قوت چھین لیتی ہے۔''

ناول میں احمد علی کا کردار قاری کو کافی متاثر کرتا ہے۔ناول میں کئی دفعہ ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار تو پروفیسر ایس سے بھی اہم ہے۔اس کردار میں مشرف عالم ذوقی نے مختلف طرح کے رنگ بھر دیئے ہیں کہ وہ ناول کے کئی مقام پر ایک الگ رنگ میں نظر آتا ہے۔کبھی وہ بے روزگاری کو پیش کرتا ہے تو کبھی وہ آندولن کاری کا مریڈ بننے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ویسے احمد علی اصل میں ایک مذہبی ذہن کا آدمی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ''ادیتی'' کے کمرے میں نماز پڑھ کر مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔اس کے علاوہ احمد علی فطرتاً ایک جذباتی باپ کے کردار میں نظر آتا ہے۔ناول نگار نے احمد علی کے کردار کو اکئی رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔جس سے وہ ناول کا اہم کردار معلوم پڑتا ہے۔

مکالمہ ناول نگار کے لیے ایک اہم حصہ ہے جس سے ناول نگار کو اظہارِ خیال کی آزادی ملتی ہے۔لیکن

اظہارِ خیال کی آزادی وہیں تک ممکن ہے جہاں اپنے موضوع اور کردار مکالمہ سے ہم خیال ہو۔اگر ناول نگار یا مصنف اپنے کرداراور موضوعات کی مناسبت بھٹکتا ہے تو فنی اعتبار سے اس میں خامی رہ جانے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ذوقی کو اپنی زبان پر قدرت حاصل ہے انہیں معلوم ہے کہ کون سے الفاظ کہاں اور کس کردار سے ادا کروانا ہے۔انہیں اپنے مکالموں کے ذریعہ قاری میں دلچسپی بنائے رکھنے کا ہنر معلوم ہے۔ان کا یہ فن اس ناول میں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ملاحظہ ہو:

''اور یقین جانوں۔اس قتل واجب سے کسی کا نقصان نہیں ہے۔اور کسی کا
کیا نقصان ہوسکتا ہے جب کہ سب کچھ ایک بڑے نقصان کو کم کرنے کے
لیے____ میرا مطلب ہے...........''
'قتل واجب ، برا نقصان ۔ یقیناً تم مذاق کر رہے ہو ____ کوئی قتل
واجب کیسے ہو سکتا ہے اور کسی بڑے نقصان سے بچانے کے لیے
____ کس کو؟______ دنیا کو یا اپنے آپ کو .... چھوٹا نقصان
____ یعنی قتل ____ تم جانتے ہو، تم ایک قتل کی دفاع کر رہے ہو____ '
'آہ، تم بھی۔تم بھی اسی انداز میں باتیں کر رہے ہو۔جیسے...........'
'جیسے پروفیسر...........'
'بالکل ٹھیک____''

اس ناول میں ذوقی نے منظر نگاری کی بہترین عکاسی کی ہے۔ناول نگار نے سونامی کے لہروں سے برباد ہونے والی زندگی اور اس کی تباہی کی زد میں آنے والے لوگوں کی آہ و بقا کے منظر کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ناول کی ایک اہم خوبی یہ بھی کہ اس کے بیان میں جو منظر پیش کیا جائے اسے قاری خود محسوس کرے کہ وہ اس مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔اور اس میں ذوقی کامیاب نظر آتے ہیں۔درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''لہروں کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ کئی لاشیں بری طرح مسخ ہو چکی تھیں اور پہچان سے باہر تھیں
____ متاثرہ علاقوں میں کام کر رہے سماج سیوا کے کارکنار نے پایا کہ کئی لاشوں کے سر ہی
نہیں ہیں ____ چلیڈی نگر کے زیادہ تر باشندوں کی لاشیں جھاڑیوں یا بجلی کیتاروں میں

پھنسی ہوئی تھیں____ نگا پٹنم ساحلی نشان کے ایک کلومیٹر کے دائرے میں آنے والے
پنپہسہار، پڈپا پٹنم، پٹنا چری، ناگٹا جیری، سمنتھی پٹّی اور کئی دوسرے علاقے ملبے میں
تبدیل ہوگئے تھے__ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کچھ دن پہلے یہاں لوگوں کی
ہنستی کھیلتی بستیاں بھی آباد رہی ہوں گی۔''

مشرف عالم ذوقی کی تحریریں اردو ادب میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ان کے قلم میں وہ جادو ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔اپنی تحریروں سے انھوں نے قاری کے دل و دماغ پر راز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بہترین تخلیق کے لئے خوبصورت لفظوں کا ذخیرہ ضروری ہے اور اس میں ذوقی کو مہارت حاصل ہے۔کہانی میں جان ڈالنے کے لیے زبان و بیان کا ہونا اہم ہے۔اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ذوقی اپنے ناولوں میں نت نئے الفاظ کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ذوقی نے اس ناول میں لب ولہجہ اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملے، وہیں مقامی زبان کا استعمال بخوبی کیا ہے۔ذوقی کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں پر بھی قدرت حاصل ہے۔

ذوقی کا اسلوب اپنے ہم عصروں سے منفرد ہے انہیں معلوم ہے کہ کسی بھی ادیب کی شناخت اسکا اسلوب بھی اہم رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں الگ الگ اسلوب اور تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ذوقی ناول کو خوبصورت بنانے کے لئے صنائع تمثیل اور استعاروں کا خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ذوقی نے اس ناول میں فلیش بیک اور فلیش فارورڈ کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔
ذوقی کی سب سے اہم خوبی رہی ہے کہ وہ وقت کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے ہیں اور مجودہ عہد میں ہونے والے واقعات کو اپنے مشاہدے میں لاکر اسے قاری کے سامنے پیش کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔یہی وجہ ہے کہ 27/دسمبر 2004ء کی سونامی کے قیامت خیز طوفان کو اس ناول میں ہمیشہ کے لئے قید کر لیا ہے۔وہیں اس ناول میں ادب کے اندر ہونے والے مختلف واقعات پر طنز کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے۔ان کے فکر و فن کی گہرائی نے اردو ادب میں انہیں اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔

Razia Ayesha Jawaiz
Research Scholar
Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

ISSN : 2582 - 3612

''ساغرِ ادبُ'' کا دسواں شمارہ (آپ کی نظر میں)

☆ عزیز مکرم پروفیسر سیّد آلِ ظفر، سلام ورحمت

سِہ ماہی ''ساغرِ ادبُ'' کا دسواں شمارہ نظر نواز ہوا۔سعید رحمانی کی حمد پاک اور حفیظ بنارسی کی نعت پاک، دونوں مستغنی عن التوصیف ہیں، جی تو چاہتا ہے کہ دونوں مظاہر عقیدہ کے اوصاف بیان کرنے میں صفحات کے صفحات قلم بند کردئے جائیں لیکن مکتوب میں اس کی گنجائش کہاں، خصوصاً جب اور بھی کچھ کہنا ہو اور طبیعت کی ناسازی لکھنے میں مانع ہو۔

چند مضامین جستہ جستہ پڑھے، اچھے لگے، جی چاہا کہ مکمل پڑھوں اور مفصل لکھوں، لیکن فرصت ناسازی طبع کب دیتی ہے! پروفیسر عبدالبرکات کا مضمون قیس آروی سے متعلق بہت سے گوشے منور کرتا ہے۔ڈاکٹر محمد رئیس کا مضمون مظہر امام پر بالتفصیل پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات پر ڈاکٹر وصی حیدر کا مضمون اسی شمارے میں چھپ گیا جب کہ مولانا آزاد کا قومی طور پر تسلیم شدہ یوم پیدائش ۱۱رنومبر کو منائے جانے سے اسے ''ساغرِ ادبُ'' کے اگلے شمارے میں چھپنا چاہئے، بہر طور معلومات افزا مضمون ہے۔عبداللہ حسین پر ڈاکٹر حارث حمزہ لون، مجروح سلطان پوری پر ڈاکٹر جبیں فاطمہ، اختر شیرانی کی رومانی شاعری پر ڈاکٹر وکیل احمد، منظر اعجاز کے شعری کمالات پر ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن، عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹر محمد علی حسن کا مضمون اور چند دیگر مضامین دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون ''گہن: ایک تجزیہ'' ہے تو مختصر لیکن اختصار کے پیرائے میں بہت ہی عریاں سا لگتا ہے۔آپ کے رسالہ ''ساغرِ ادبُ'' کی ثقاہت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ویسے عورتوں کی ہم جنسیت پر عصمت چغتائی کا ''لحاف'' اس طرح کی تخلیق کا جواز فراہم کرتا ہے۔بحیثیت تخلیق اس کا درجہ ناقدین متعین کریں لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم عصمت چغتائی کے ''لحاف'' کا ہی تجزیہ کرنے کے لئے ''ساغرِ ادبُ'' کے صفحات کا انتخاب کریں۔

''علی گڑھ کے خاکہ نگار'' بھی اچھا مضمون ہے۔اب آیئے سب سے زیادہ متاثر کرنے والے مضمون کا ذکر آخر میں کروں، ورنہ میرا مکتوب ادھورا رہ جاتا اور وہ ہے پروفیسر عبدالواسع کا مختصر سا مضمون پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی پر ''جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے'' کے عنوان سے۔یہ مضمون واقعی پڑھنے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

والے کو رُلا جاتا ہے۔

دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست اور سلامت رکھے اور اسی طرح ادب کی خدمت انجام دیتے رہیے۔

دعا گو

(پروفیسر) نجم الہدیٰ، مظفرپور

☆ مدیر محترم سلام ورحمت!

''ساغرِ ادب'' کا تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء) پیشِ نظر ہے۔ ہر لحاظ سے بہت ہی گراں قدر اور قابلِ مطالعہ ہے۔ سعید رحمانی صاحب جیسے کہنہ مشق شاعر کے حمد یہ کلام کا کیا کہنا۔ بہت خوبصورت اور روح پرور ہے۔ پروفیسر حفیظ بنارسی مرحوم کی نعتِ پاک منتخبات میں سے ہے۔ یہ فکر وفن کا کامیاب ترین نمونہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایمان کے گلشن میں تازہ بہار آجاتی ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

حصۂ مضامین و مقالات بھی بہت ہی معیاری و فکر انگیز ہے۔ خاص طور پر پروفیسر عبدالواسع، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر منظر حسین اور ڈاکٹر سید احمد قادری کے مضامین ومقالات بہت پسند آئے۔ گوشۂ ریسرچ اسکالرز کو بھی بہت سلیقے سے آپ نے مرتب کیا ہے۔ اس کے تحت بھی ریسرچ اسکالرس نے اچھی کاوشیں کی ہیں۔ خدا ان کے مستقبل کو تابناک بنائے۔ ''ساغرِ ادب'' کا نواں شمارہ بھی صاحبانِ فکر ونظر کے لئے توجہ کش بنا ہے۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے سراہا ہے۔ اس سے آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفرپور

☆ عزیزم سید آلِ ظفر   دعائے خیر!

''ساغرادب'' جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء یعنی دسواں شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ سادگی میں پرکاری کا کمال سرِ ورق سے ہی ظاہر ہے اور اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ ''ساغرِ ادب'' بہ اعتبار ہندی ادب کا سمندر ہے جو اسم بامسمیٰ ہے اور سید آلِ ظفر بھی اس صداقت کے امین ہیں۔ حمد باری اور نعت حضور اقدس ﷺ اپنی جملہ خوبیوں کی بدولت دامنِ دل تھام لیتے ہیں۔ حمد کے اشعار سورہ قل ھو اللہ احد کی تفسیر پر مبنی ہے اور دعا مردِ مومن کا خاصہّ ہے۔

بھیک رحمت کی طلب کرتا ہے تجھ سے یہ سعید
اپنے عصیاں پہ پشیماں ہے یہ بندہ تیرا

ISSN : 2582 - 3612

ربوبیت میں سجدہ ریزی کے بعد نبیؐ کریم سے محبت ایمان کا جزو ہے اور اس کی بنیاد عشقِ حقیقی پر مستحکم ہے۔

مومن کے لیے شرط تیرا عشق حقیقی
ایمان کی بنیاد تیرے عشق سے محکم

مرحوم حفیظ بنارسی کے لیے اس سے بڑی خراجِ عقیدت کیا ہوگی کہ ہنوز ان کے اشعار بارگاہِ رسالت میں اخروی زندگی کا ضامن ہیں۔

پہلا مقالہ پروفیسر عبدالواسع صاحب کا ہے جس میں انھوں نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے سلسلے میں بہت ساری معلومات فراہم کی ہیں۔ اللہ ان کا سایہ تا دیر سلامت رکھے تاکہ ہم تمام شائقین ادب ان کی تحریروں سے مستفید ہوں۔

دوسرا مضمون پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا ہے۔ علی گڑھ کے خاکہ نگار کے تحت اپنی گفتگو کی ہے لیکن اس کا اطلاق تمام خاکہ نگاروں پر ہوتا ہے خواہ ان کا تعلق کہیں سے ہو۔ بہر حال اس صنف کی معنویت و افادیت کے پیشِ نظر گراں قدر مقالہ پیش کیا ہے جو اپنی نوعیت کا انوکھا مقالہ ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے نگارِ عظیم کے افسانہ ''گہن'' کے ذریعے یہ باور کرایا ہے کہ ''ہتک'' ہتک ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی قبیلے سے کیوں نہ ہو اور اندھیرے میں روشنی کی چمک آج بھی قائم ہے۔ شین۔ اختر کی رحلت اردو ادب کے لیے سانحۂ عظیم سے کم نہیں ہے جس کی تلافی عہدِ حاضر میں ناممکن ہے۔ البتہ علم وادب کا نایاب نمونہ ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہے اور ان کے شاگردِ عزیز تہذیب الحسن جیسے دانشور سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر شین۔ اختر، ابوالکلام قاسمی اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں جیسی عظیم ہستیوں نے ادب اردو کا وہ سرمایہ چھوڑا ہے جس پر ہم جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں میرے ہمدمِ دیرینہ تھے، ہیں اور رہیں گے اس لیے کہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات یادِ ماضی میں گم کر دیتے ہیں اور ہم بلا شبہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اللہ سے دعا ہے کہ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ فکشن، کلامیہ اور ثقافتی مکانیت پر ڈاکٹر ریاض توحیدی کا مقالہ کافی اہم ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے کافی مواد فراہم کیا ہے لیکن اندازِ بیان ثقافت کی متحمل نہیں ہے۔ اس لیے مزید استفسار کی ضرورت ہے۔ مراسلہ اور مکتوب میں پروفیسر نجم الہدیٰ کا ہر جملہ معنی خیز ہے اور اس کی حیثیت ایک اصطلاح کی ہے۔ اوراق کی ہر بات میں ایک بات پوشیدہ ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

آپ گفتگو ہی گفتگو میں اتنی پتے کی بات کہہ دیتے ہیں جن کے لیے بہت سارے اوراق ناکافی ہوں گے۔ اس لیے تحریف کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں ع

مستند ہے تیرا فرمایا ہوا

حق گوئی، بے باکی اور علمی تہہ داری کے ساتھ خدا ترسی اور دین داری ان کی زندگی کا اہم جز ہے۔ اللہ ان کو لمبی عمر عطا کرے تاکہ ہم تشنگانِ ادب فیضیاب ہوتے رہیں اور ان کی حق گوئی اور بے باکی ہمارے لیے چراغِ راہ ثابت ہو۔

مراسلہ میں طوالت مانع ہے اس لیے تمام مرحومین نابغۂ روزگار ہستیوں کے بارے میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں ۔

بادل تو اپنا فرض نبھاکر چلا گیا
ہم تشنہ لب رہے یہ مقدر کی بات ہے

آج کے اس ''کرونائی'' ماحول میں ہر آدمی تشکک اور تذبذب کا شکار ہے اس لیے ہم سب بارگاہِ الٰہی میں ملتجی ہیں۔

کوئی صورت نکال دے یارب
حادثہ سر سے ٹال دے یارب

''ساغر ادب'' کے تمام مضامین جن کا تعلق مختلف شعبۂ حیات سے ہے جو اپنی انفرادیت کے مسند پر گامزن ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نسخۂ بے بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسالہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں اور اس کی واحد وجہ آپ کا جنون ہے خدا اس جنون کو سلامت رکھے۔

فقط والسلام

پروفیسر ڈاکٹر نبی احمد، سیوان

☆ محترم پروفیسر سید آلِ ظفر

سلام وتسلیم!

آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ ''ساغر ادب'' جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء کا شمارہ موصول ہوا۔ یوں تو پورا شمارہ از شروع تا آخر دیدہ زیب اور معیاری ہے۔ لیکن چند مضامین کا میں خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گا جن کے مطالعے سے عام قاری کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا مضمون ''علی گڑھ کے خاکہ نگار''، ڈاکٹر ریاض توحیدی کا مضمون، ڈاکٹر سید احمد قادری کا

مضمون ''اردو افسانے کا انعام: پریم چند''، ڈاکٹر شبیر احمد کا مضمون ''گوپی چند نارنگ ایک نابغۂ روزگار شخصیت''، ڈاکٹر سید نور العین اقبال کا مضمون ''پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر نسرین بانو کا مضمون ''اردو کا ایک باکمال شاعر: خلیل فرحت کارنجوی''، سلمان عبدالصمد کا مضمون ''امتیاز رومی کی شاعری'' پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسالے کی سب سے بڑی خوبی گوشۂ ریسرچ اسکالر ہے۔ اس سے نہ صرف نئی نسل کی آبیاری ہوتی ہے بلکہ اردو کے فروغ میں حصہ داری بھی ادا ہوتی ہے۔ کئی ریسرچ اسکالر کے مضامین بہت اچھے ہیں جو گہرائی سے مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔

اس خوبصورت اور معیاری رسالے کے لیے آپ کو مبارک باد!

پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ

☆ قابل صد عزوشاں محترم پروفیسر سید آلِ ظفر صاحب

السلام علیکم

اللہ کے فضل وکرم سے امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی جریدہ ''ساغر ادب'' کا (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء) دسواں شمارہ پہلی مرتبہ موصول ہوا۔ اس پُرخلوص کرم فرمائی کے لئے بہ صمیم قلب شکر گزار ہوں۔ ورق گردانی تو فوراً کر ڈالی لیکن سارے مضامین کا مکمل طور پر مطالعہ کرنا باقی ہے چند مضامین 'جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے'، 'علی گڑھ کے خاکہ نگار'، 'گہن: ایک تجزیہ'، 'گوپی چند نارنگ: ایک نابغۂ روزگار شخصیت'، 'پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری'، 'پروفیسر شمیم حنفی: ایک مطالعہ' بغور پڑھے اور چند کا سرسری مطالعہ کر سکی لیکن بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ''ساغر ادب'' صوری اور معنوی دونوں اوصاف کے اعتبار سے لائق تحسین وستائش ہے۔ یہ ادبی جریدہ درحقیقت اردو ادب کا ایک ایسا گل سرسبد ہے، جس کی خوشبو وسرمستی قاری کو مسحور کئے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ یہ آپ کے پاکیزہ ادبی ذوق کی دین ہے اور اس میں شائع مضامین آپ کے منتخب کردہ لائق صد تحسین مصنّفین کی محنت کا ثمرہ ہیں۔ اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ دور حاضر میں کسی اردو رسالہ کا نکالنا اور زندہ و پائندہ رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تقریباً ۳۸ مختلف مضامین اور حمد ونعت کے اہتمام کے ساتھ آراستہ یہ مجلّہ نہ صرف جاذب نظر ہے بلکہ تلاش وتحقیق کے اعتبار سے بھی معیاری حیثیت کا حامل ہے۔ ارباب قلم پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر عبدالواسع، پروفیسر اسلم جمشید پوری وغیرہ کے رقم کردہ موضوعات اور ریسرچ اسکالرز کی کاوش کے لئے ''ساغر ادب'' مبارکباد کا مستحق ہے نیز ایک ادبی جریدہ کا مقصد نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کرتے ہوئے اردو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے نئی راہ پر گامزن کرنا ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں

''ساغرادب'' اس کا ضامن ہے۔ اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو ہم سب کو نئی نسل کو ان اوصاف کی طرف متوجہ کرنا ہوگا کیونکہ مستقبل کی امیدیں اور سارا دارو مدار نئی نسل کے کاندھوں پر ہوگا۔ 'ساغرادب' کے محققین کے مضامین اس کی دلالت کرتے نظر آتے ہیں۔ امید قوی ہے کہ آپ سبھی کی سعیِ پیہم سے انشاء اللہ فروغ اردو کے راستے ہموار ہوں گے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ کی رہنمائی میں یہ مجلّہ مسلسل اپنی ادبی خدمات میں سرگرم عمل ہے۔ اللہ اردو زبان کی خدمت کا یہ جذبہ قائم رکھے (آمین)۔ آپ کے ساتھ تمام متعلقین کو میری نیک خواہشات و مبارکباد۔ مختصراً اپنے حقیر الفاظ میں یہی کہوں گی کہ ؎

ہے ''ساغر ادب'' میں یوں اردو سجی ہوئی
پھولوں میں جیسے ہوتی ہے خوشبو بسی ہوئی

ڈاکٹر زرینہ بیگم زرّیں، الہ آباد

☆ برادرم پروفیسر سیّد آلِ ظفر! السلام علیکم

''ساغرِ ادبؔ'' کا تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء) نظر نواز ہوا۔ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی عمدہ ہے۔ اس شمارہ میں شامل جناب سعید رحمانی کی ''حمد'' نے متاثر کیا۔ پروفیسر حفیظ بنارسی کی ''نعت'' بھی بہت خوب ہے۔ عشقِ نبی میں ڈوب کر لکھی ہوئی اس نعت پاک کے اِک اِک شعر سے عشق نبی کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنی یہ نعت مرحوم پروفیسر حفیظ بنارسی جب پڑھتے تھے تو ان پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور سامعین بھی عشق رسول کے جذبے سے سرشار ہوجاتے تھے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی مرحوم کے تعلق سے پروفیسر عبدالواسع کی تحریر 'جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے' بہت پُر اثر ہے۔ ہرگانوی صاحب کی یادیں، ان کی باتیں بہت دنوں تک یاد آتی رہیں گی اور ان کے چاہنے والوں کو رُلاتی رہیں گی۔ ''یادِ رفتگاں'' کے تعلق سے ڈاکٹر منظر حسین کی تحریر بنیادش۔ اختر بھی اچھی اور معلوماتی تحریر ہے۔ دیگر مشمولات کے تحت شامل مضامین بھی عمدہ اور معلوماتی ہیں۔

مکتوبات کے کالم میں محترم پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب نے محبی ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے تعلق سے لکھی میری تحریر کی جس طرح پذیرائی کی ہے اس کے لئے میں پروفیسر موصوف کا حد درجہ ممنون ہوں اور ان کی تندرستی اور درازیٔ عمر کے لئے بھی دعا گو ہوں۔ رسالہ کی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے لئے میری دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

انوار الحسن وسطوی، حاجی پور

☆ محترم پروفیسر سید آلِ ظفر صاحب

السلام علیکم

سہ ماہی ''ساغرادب'' کا جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء کا شمارہ ملا شکریہ۔ بھئی ہندوستان میں رسائل تو بے شمار شائع ہو رہے ہیں لیکن جو بات ''ساغرادب'' کو دیگر رسائل سے الگ کرتا ہے وہ ہے اس کی وقت پر اشاعت۔ اس رسالے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں شعری اصناف نہیں ہے جس کی وجہ سے نئے نثر لکھنے والوں کو یا ریسرچ اسکالرز کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ اس کے مطالعے سے جہاں ریسرچ اسکالرز کی معلومات میں اضافہ ہوگا وہیں ان کے اندر نثر لکھنے کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ قلیل مدت میں اس رسالے نے ہندوستان گیر پیمانے پر جیسی مقبولیت حاصل کی ہے ایسا کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیر مطالعہ شمارے میں ناول، افسانہ، تحقیق، تنقید، صحافت، شاعری، شخصیت، جدیدیت موضوعات پر بھرپور مضامین شامل ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کا گوشہ بھی قابل تعریف ہے۔ ان سبھوں نے اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ نئی نثر لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ اردو نثر کی دنیا میں ابھر کر سامنے آئے گا۔

ڈاکٹر محمد عمران قریشی، پرولیا، مغربی بنگال

☆ پروفیسر سیّد آلِ ظفر صاحب تسلیمات

''ساغرِ ادبؔ'' جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء کا شمارہ نہ صرف دیکھنے بلکہ پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ آج کی تاریخ میں رسالہ ''ساغرِ ادبؔ'' اردو کی ادبی صحافتی تاریخ میں نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ خاص اہمیت کا حامل بھی۔ ''ساغرادبؔ'' اب اردو کا عالمی رسالہ بن چکا ہے۔ سب سے اہم اور بڑی بات یہ ہے کہ اردو کے نامور ادیب و دانشور کا تعاون بھی اس رسالے کو شامل ہے۔ ''حمد'' سعید رحمانی ''نعت'' پروفیسر حفیظ بنارسی کے بعد استاذی پروفیسر عبدالواسع صاحب، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر محمد رئیس اور ڈاکٹر شبیر احمد وغیرہ کے گراں قدر مضامین دعوتِ غور وفکر دیتے ہیں۔

گوشۂ ریسرچ اسکالرس کی جتنی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے۔ نئی نسلوں کی ذہنی آبیاری میں ''ساغرِ ادبؔ'' کے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اللہ حافظ

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی، مظفرپور

☆☆☆